Urdu ke Mufakkereen E Taleem ki Adabi Khidmaat-Tehqeeqi Wo Tanqueedi Mutala

(Beesween sadi ke Hawale Se)

dissertation submitted to the University of Hyderabad

in partial fulfillment of the requirement for the award of the Degree of

MASTER OF PHILOSOPHY

submitted by

MD TAYAB ALAM

under the supervision of

DR MD. ZAHIDUL HAQUE

Department of Urdu,

School of Humanities,

University of Hyderabad, Hyderabad-500046

(Telangana)

2022

اردو کے مفکرین تعلیم کی ادبی خدمات تحقیقی وتنقیدی مطالعہ
(بیسویں صدی کے حوالے سے)

مقالہ برائے ایم۔فل

مقالہ نگار

محمد طیب عالم

رجسٹریشن نمبر(20HUHL04)

نگراں

ڈاکٹر محمد زاہدالحق

شعبۂ اردو

اسکول آف ہیومینٹیز،

یونی ورسٹی آف حیدرآباد، حیدرآباد۔500046

CERTIFICATE

This is to certify that the dissertation entitled "URDU KE MUFAKKEREEN E TALEEM KI ADABI KHIDMAAT-TAHQEEQI WO TANQUEEDI MUTALA (Beesween Sadi Ke Hawale Se)" submitted by MD TAYAB ALAM bearing Registration No. 20HUHL04 in partial fulfillment of the requirement for the award of the degree of Master of Philosophy is a bonafide work carried out by him under my supervision and guidance.

The said dissertation has not been submitted previously in part or full to this or any other university/Institution for the award of any degree or diploma.

Signature of Supervisor

Counter Signature

Head of the Department

Dean

School of Humanities

DECLARATION

I MD TAYAB ALAM hereby declare that this dissertation entitled **URDU KE MUFAKKEREEN E TALEEM KI ADABI KHIDMAAT-TEHQEEQI WO TANQUEEDI MUTALA** (Beesween Sadi Ke Hawale Se)" submitted by me under the guidance and supervision of Dr. Md. Zahidul Haque is a bonafide research work which is also free from plagiarism. I also declare that it has not been submitted previously in part or full to this university or any other institution for the award of any degree or diploma. I hereby agree that my thesis can be deposited in shodhganga/INFLIBNET.

Date

Signature of Student

MD TAYAB ALAM

Reg.No:20HUHL04

NATIONAL SEMINAR
ON
Farogh-e-Urdu Me Ulama Ka Kirdar
ON 20 February 2022 N.17 A /160. Pattharwala Bagh, J.J Colony, Wazirpur, Delhi-110052

Certificate

The Certificate is awarded to MD TAYAB ALAM For participation / presentation Of paper on MOULANA MUJAHID HUSSAIN KI NATIA SHAIRI in the national seminar organized by Madarsa Ahmadia Sayyadul Uloom Intazamia Education Society (Regd.) in association with National Council For Promotion Of Urdu Language.

Md Atikur Rahaman Manzari
President

Sayyad Md Adibur Rahaman Misbahi
Co-ordinator

فہرست

پیش لفظ ———————————————— 10

باب اول : ———————————————— 13

تعلیم

الف: تعلیم کیا ہے

تعلیم کی مختلف تعریفات

تعلیم کے مقاصد

ب: کیا (مطلوبہ) دانشوران اردو مفکر تعلیم تھے

حوالہ جات

باب دوم: ———————————————— 23

انیسویں و بیسویں صدی کے ہندستان کے سیاسی،تہذیبی اور تعلیمی حالات

جدید ہندوستان

انگریزوں کا بنگال پر تصرف/جنگ پلاسی

ریاست میسور پر قبضہ

برطانوی عہد میں تعلیم

چارٹر ایکٹ-1813

وڈس ڈسپیچ-1854

یونیورسٹی ایکٹ-1904 (لارڈ کرزن کی تعلیمی پالیسی)

حوالہ جات

باب سوم: ——————————————————— 33

اردو کے مفکرین تعلیم اور ان کی ادبی خدمات (بیسویں صدی کے حوالے سے)

مولانا ابوالکلام آزاد

حالات زندگی

مولانا آزاد کا تصور تعلیم

تعلیم بالغان

ذریعہ تعلیم اور مغربی علوم

مذہبی تعلیم

اساتذہ قوم کے معمار

مدارس کے نصاب میں تجدیدیت کے حامی

تعلیم نسواں

مولانا آزاد کا تعلیم کے شعبے میں تعاون

مولانا آزاد کی ادبی خدمات

حوالہ جات

علامہ اقبال

حیات زندگی

تصور تعلیم

اقبال اور مغربی تعلیم

تعلیم نسواں

اقبال، مغربی سائنس اور مادیت پرستی

اقبال اور مغربی تہذیب

اقبال اور مذہبی علوم

علامہ اقبال کی ادبی خدمات

حوالہ جات

سید اکبر حسین الہ آبادی

حالات زندگی

اکبر اور تہذیب نو

اکبر کا نظریہ تعلیم

تعلیم نسواں

اکبر اور مغربی تعلیم

اکبر اور مذہب

اکبر کی ادبی خدمات

حوالہ جات

ڈاکٹر ذاکر حسین

حالات زندگی

ڈاکٹر ذاکر حسین کے تعلیمی نظریات

ذاکر حسین کی تعلیمی خدمات

حوالہ جات

خواجہ غلام السیدین

حالات زندگی

سیدین کا تصور تعلیم

خواجہ غلام السیدین کی تصنیفی اور ادبی خدمات

حوالہ جات

حاصل مطالعہ ______ 85

کتابیات ______ 89

پیش لفظ

مسرت جہاں لکھتی ہیں:

’’تھیسس (thesis) لکھنا ہفت خوان رستم طے کرنے سے کم کارنامہ نہیں‘‘ یقیناً ہر ریسرچ اسکالر کے لیے یہ ایک چیلنج بھرا دور ہوتا ہے۔مقالہ نگار اپنی تحقیق کے حصار سے اس وقت تک باہر نکل نہیں پاتا جب تک اس کی تحقیق مکمل نہ ہو جائے۔کئی دشواریوں کا سامنا ہمیں بھی کرنا پڑا۔خصوصاً کوڈ ۱۹ کے درمیان مواد اکٹھا کرنے میں کئی پر خار راہوں اور سنگلاخ زمینوں سے ہمیں بھی گزرنا پڑا لیکن بفضل تعالیٰ اب یہ ایم فل کا مقالہ اپنے پایۂ تکمیل کو پہنچ چکا ہے۔

یہ مقالہ تین ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔پہلا باب ’’تعلیم‘‘ کے عنوان سے ہے۔اس میں تعلیم کی مختلف تعریفات اور مقاصد بیان کیے گئے ہیں نیز مفکرین و ماہرین تعلیم کے درمیان فرق اور مفکرین تعلیم کون ہو سکتے ہیں اس کی وضاحت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

دوسرا باب ’’انیسویں و بیسویں صدی کے ہندستان کے سیاسی،تہذیبی اور تعلیمی حالات‘‘ کے عنوان سے باندھا گیا ہے۔کسی بھی ادیب،شاعر یا ادبی شخصیت کے علمی و ادبی یا نظریے کو جاننے کے لیے اس کے عصری حالات و واقعات سے واقفیت ضروری ہے تا کہ یہ بات واضح ہو سکے کہ کن حالات اور واقعات سے متاثر ہو کر انھوں نے اپنے نظریۂ تعلیم کی تبلیغ واشاعت کا سلسلہ شروع کیا تھا۔لہٰذا اس باب کے تحت انیسویں و بیسویں صدی کے سیاسی،تہذیبی اور تعلیمی حالات پر گفتگو کی گئی ہے۔

تیسرا باب ’’اردو کے مفکرین تعلیم اور ان کی ادبی خدمات تحقیق وتنقیدی مطالعہ بیسویں صدی کے حوالے سے‘‘ پر مشتمل ہے۔یہی باب تحقیق کا اصل موضوع ہے۔اس میں پانچ مفکرین اردو (مولانا آزاد،علامہ اقبال،اکبر الہ آبادی ،ڈاکٹر ذاکر حسین اور خواجہ غلام السیدین) کے تعلیمی نظریات اور ان کی ادبی خدمات کو شامل کیا گیا ہے۔ان مفکرین کی مختصراً حیات پیش کرنے کے بعد ان کے سیاسی،سماجی اور مذہبی نظریات سے بچتے ہوئے صرف ان کے تعلیمی نظریات کو سامنے لانے کی کوشش کی ہے اور ساتھ ہی ان کی ادبی خدمات کو بھی شامل مطالعہ رکھا ہے۔

مذکورہ مفکرین تعلیم کے حوالے سے تعلیم کے جن پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے وہ بظاہر الگ الگ معلوم ہوتے ہیں لیکن مجموعی اعتبار سے دیکھا جائے تو شخصیت کی تعمیر کے لیے وہ سب بہت اہم ہیں،ان کو پڑھنے کے بعد محسوس ہوتا

ہے کہ تعلیم آدمی کو انسان بنانے اور سماج کو بہتر بنانے کی غرض سے دی جاتی ہے۔

ہمارے دیگر مفکرین کے بھی تعلیمی نکات ونظریات موجود ہیں۔میری تحقیق کے مطابق ان کے نظریات کا احاطہ ابھی تک نہیں کیا گیا ہے۔ضرورت تھی کہ ان مفکرین کے تعلیمی نظریات کو باہر لایا جاے تا کہ ان کے نظریات کے تعلق سے کوئی رائے یا موقف رکھنے میں آسانی ہو اور جس سے نظام تعلیم کو بہتر بنانے،اس کی افادیت کو بروے کار لانے اور اس کو مہمیز کرنے میں خاطر خواہ مدد مل سکے۔اللہ کا شکر ہے کہ مجھ جیسے کم علم اور ادنیٰ طالب علم کو مشفق نگراں ڈاکٹر محمد زاہد الحق کے سایے میں ان حضرات کے تعلیمی نظریات پر کام کرنے کا موقع ملا۔انہوں نے نہ صرف موضوع کے انتخاب میں میری مدد کی بلکہ نگرانی بھی قبول فرمائی۔ میں ان کا بے حد ممنون ہوں۔

میں شکر گزار ہوں اپنے آر اے سی ممبر پروفیسر حبیب نثار کا جن کی رہنمائی سے میں نے بہت کچھ سیکھا اور پڑھا۔ساتھ ہی شعبے کے دیگر اساتذہ کرام کا شکر گزار ہوں جن سے مجھے ہر اعتبار سے فیض یاب ہونے کا موقع ملا۔خدا کرے ان اساتذہ کا سایہ ہم طلبا کے سروں پر تا دیر قائم رہے۔

بلا شبہ اس مقام تک پہنچنے اور اعلی تعلیم کے حصول میں میرے والدین کی نیک خواہشات اور ان کی دعا شامل رہی ہے۔ نیز ہمارے بھائیوں اور بہنوں کی حوصلہ افزا باتوں اور مشوروں نے ہمیں کہیں تھکنے نہیں دیا۔میری اہلیہ حافظہ شیبہ نشاط نے مجھے گھریلو معاملات اور آپسی جھمیلوں سے حتی الامکان دور رکھا جس کی وجہ سے مقالے کو انجام تک پہنچانے میں آسانیاں پیدا ہوئیں۔

بے حد احسان مند ہوں ان مخلص احباب کا جنہوں نے مقالے کی تکمیل میں کسی بھی طرح سے میری مدد کی ہے۔خصوصاً ڈاکٹر عدیلہ جسیم اور غلام علی کا جنہوں نے مقالے کی تزئین میں میرا ساتھ دیا۔اللہ انہیں تندرستی دے۔

محمد طیب عالم

باب اول

تعلیم

الف۔

تعلیم کیا ہے؟

تعلیم سے مراد کیا ہے۔اس بارے میں متعدد ماہرین تعلیم کے مختلف خیالات ہیں۔تعلیم کی نوعیت اور امور کی وضاحت خاص طور سے فلسفیوں، ماہرین عمرانیات اور ماہرین سیاسیات نے کی ہے۔کچھ ماہرین تعلیم سے مراد یہ لیتے ہیں کہ بچہ اپنے سماج اور اپنی زندگی کے مختلف شعبوں سے ہم آہنگ ہو سکے اور کچھ لوگوں کا ماننا ہے کہ بچہ سماج کے لئے مفید بن جائے۔بعض ماہرین کے نزدیک تعلیم سے مراد صرف یہ ہے کہ ایک بچہ نت نئے تجربے کر سکے تاکہ اس کا تخلیقی جوہر نکھر کر سامنے آ سکے اور زندگی آسان ہو، اس کے علاوہ مختلف ماہرین تعلیم اور فلسفیوں نے تعلیم کی مختلف تعریفیں کی ہیں جن میں سے کچھ تعریفات مندرجہ ذیل ہیں:

تعلیم کی مختلف تعریفات

تعلیم کا مطلب ان آفاقی معقولیت (Universal validity) کے تصورات (Ideas) کو باہر نکالنا ہے جو کہ ہر انسان کے دماغ میں پوشیدہ ہوتے ہیں۔(socrates)

تعلیم ایک ایسا عمل ہے جس سے انسان اپنے باطن (internal) کو ظاہری (external) بناتا ہے۔(Frobel)

تعلیم سے میری مراد بچوں اور افراد کی بہترین جسمانی، ذہنی اور روحانی صلاحیتوں کو اجاگر کرنا ہے۔
(MK.Gandhi)

تعلیم کا پورا عمل انسان اور سماجی گروہ کے بیچ باہمی تعامل ہے جس کا اختتام انسانوں کی نشو نما کے طور پر ہوتا ہے۔(A K C Ottaway)

تعلیم کا کام انسان کو اپنے ماحول کے ساتھ اس حد تک مطابقت پیدا کرنا ہے کہ انسان اور سماج دونوں کو زیادہ تسکین حاصل ہو سکے۔(Bossing)

تعلیم سے مراد ماحول کے فرد واحد پر ہونے والے ایسے اثرات سے ہے جو کہ اس کے کردار، طرز عمل، سوچ اور رویے میں نمایاں اور مستقل تبدیلی لاتے ہیں۔ ماحول کے مختلف پہلو ہیں۔طبعی، سماجی اور ثقافتی اور تعلیم کو ایسی ہونی چاہئے جو کہ بچے میں ماحول کے تئیں بہتر مطابقت کی صلاحیت پیدا کر سکے۔(Thomspon)

تعلیم کے جتنے بھی مذکورہ تعریفات وتوضیحات پیش کی گئی ہیں یہ سب منفرد اور مختلف ہیں کیونکہ فلسفیوں، ماہرین عمرانیات اور ماہرین سیاسیات اور ماہرین نفسیات نے اپنے اپنے اعتبار سے تعلیم کو دیکھنے کی کوشش کی ہے۔تعلیم کی ایک مکمل تعریف یوں بھی ہوسکتی ہے:

> ''تعلیم کسی سماج میں ہمیشہ چلنے والا وہ بامقصد عمل ہے جس کے ذریعہ انسان کی خداداد صلاحیتوں کی نشونما اس کے علم وفن میں اضافہ اور طرز عمل میں تبدیلی کی جاتی ہے اور اسے ایک مہذب اور تہذیب یافتہ شہری بنایا جاتا ہے۔ اس کے ذریعہ فرد اور سماج دونوں مسلسل ترقی کرتے رہتے ہیں''(۲)

تعلیم کے مقاصد

تعلیم کا دائرہ بے حد وسیع ہے۔ ماہرین تعلیم جس طرح تعلیم کی کسی ایک تعریف اور مفہوم پر اتفاق نہیں رکھتے۔ اسی طرح تعلیم کے مقاصد پر بھی اتفاق نہیں رکھتے بلکہ سب کا نظریہ اس حوالے سے مختلف ہے۔
تاریخ کے ہر دور میں تعلیم کے مقاصد کا تعین ہوتا رہا ہے۔اور ابتدا سے ہی اس بات کی بھی کوشش کی جاتی رہی ہے کہ تعلیم کا ایک جامع اور حتمی مقصد متعین ہو لیکن ایسا کبھی ممکن نہیں ہو پایا۔جیسا کہ ڈاکر ضیاء الدین علوی لکھتے ہیں:

> ''تہذیب کے ابتدا سے ہی تعلیم کا ایک جامع مقصد متعین کرنے کی کوششیں ہوتی رہی ہیں۔انسان اپنی ضروریات اور مسائل کے پیش نظر تعلیم کے مقاصد متعین کرتا رہا ہے۔ کچھ معاشرے مذہب پر زیادہ زور دیتے تھے۔ کچھ روحانیت پر۔ کچھ سیرت کی تشکیل پر۔"(۳)

ماہرین کا آج تک تعلیم کے ایک خاص مقصد پر اتفاق نہ ہونے کی کئی وجوہات ہیں۔ جیسے نظریۂ حیات ، انسان کے مختلف حالات وضروریات، ماحول، مذہبی عقائد، سیاسی نظریات، سماجی اور اقتصادی حالات تعلیم کے مقاصد کا تعین کرنے میں بہت زیادہ اثر انداز ہوتے ہیں۔ مثلاً جب ہم انسانوں کے نظریہ حیات پر غور کرتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ کچھ لوگ دنیاوی زندگی اور اس کی لذتوں کو ہی سب کچھ سمجھتے ہیں۔ لہٰذا ان کے نزدیک دولت واقتدار کا حصول ہی سب کچھ ہے۔ اس کے برعکس کچھ لوگوں کے یہاں زندگی کا تصور عارضی ہے اور مابعد موت کو اصل زندگی سمجھتے ہیں لہٰذا ان کے یہاں تعلیم کا تصور بدل جائے گا۔ نظریہ حیات کے اس اختلاف سے تعلیم کا مقصد بھی بدل جاتا ہے۔

اسی طرح کسی ملک کے سماجی حالات اور سیاسی نظریات بھی تعلیم کے مقاصد پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ جیسے جمہوری ممالک میں انفرادی آزادی اور انفرادیت کی نشوونما پر زیادہ زور ہوتا ہے۔ جیسے جسمانی تربیت، جذباتی تربیت، اخلاقی تربیت، سماجی تربیت، روحانی تربیت، جمالیاتی تربیت، اچھا شہری بنانا، انفرادیت کی نشونما، اجتماعیت کی نشونما ، سیرت کی تشکیل، فرصت کے اوقات کو اچھی طرح گزارنے کی تربیت وغیرہ تعلیم کے خاص اور اہم مقاصد ہیں۔

تعلیم کی ضرورت واہمیت

نسل انسانی جتنی پرانی ہے تعلیم بھی تقریباً اتنی ہی پرانی ہے۔ دراصل انسان تعلیم حاصل کرنے کی صلاحیت کی بنا پر حیوانات سے ممیّز سمجھا جاتا ہے۔ تعلیم کسی بھی سماج کی بقا اور ترقی کے لئے ناگزیر عمل ہے۔ انسانی تہذیب کے ارتقا کے ہر دور میں اس کی افادیت کو محسوس کیا گیا ہے۔ کیونکہ انسان کا تعلق خواہ کسی بھی فلسفۂ حیات سے کیوں نہ ہو اسے اپنی زندگی کے مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے تعلیم کا سہارا لینا ہی پڑتا ہے۔ ڈاکٹر ضیاء الدین علوی لکھتے ہیں:

> ’’آج کے مہذب معاشرے میں ایک بہتر زندگی گزارنے کے لئے تعلیم کی سخت ضرورت ہے۔ تعلیم کے بغیر مہذب زندگی بسر نہیں ہوسکتی۔ آج ہر قدم پر ہمیں تعلیم کی ضرورت کا احساس ہوتا ہے اس کے بغیر ایک اچھا انسان، ایک مہذب شہری اور ایک ذمہ دار شخص نہیں بن سکتا ہے۔ جب کبھی ہم بہتر زندگی کا تصور کریں گے تو تعلیم کی ضرورت محسوس ہوگی۔‘‘ (۴)

ڈاکٹر ساجد جمال لکھتے ہیں.

''تعلیم ہمیشہ سے انسانوں کو ایک بہتر معیار زندگی عطا کرتی آئی ہے یہ کسی بھی قوم میں
با کردار، با صلاحیت اور روشن خیال شخصیات پیدا کرتی ہے۔''(۵)

دنیا کے ہر مذاہب میں تعلیم و تعلم کا رواج ہے اور ہر مذاہب میں تعلیم کو کلیدی حیثیت حاصل ہے۔ اسلام نے اہل علم کی خوبیاں اور بڑائیاں گنا کر ان کے مرتبے بڑھائے۔ چنانچہ سورہ انبیا آیت 7 میں ہے:

''آئے لوگوں اہل علم سے پوچھو اگر تمہیں علم نہ ہو۔''(٦)

سورہ الزمر آیت نمبر ۹ میں ہے:

''کیا جاننے والے اور نہ جاننے والے برابر ہو سکتے ہیں۔''(۷)

اسلام میں وحی الٰہی کے آغاز ہی میں، جس بات کی طرف آپ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ نوع بشر کو توجہ دلائی گئی وہ لکھنا، پڑھنا اور تعلیم و تربیت کے زیور سے انسانی زندگی کو آراستہ کرنا تھا۔

شاعر کہتا ہے:

حیرت ہے کہ تعلیم اور ترقی میں ہے پیچھے
جس قوم کا آغاز ہی اقرا سے ہوا تھا

احادیث میں بھی علم اور اہل علم کے لئے بڑی فضیلتیں بیان کی گئی ہیں۔ اسلام نے علم حاصل کرنے کو ضروری قرار دیا ہے۔ ایک حدیث میں ہے:

''علم حاصل کرنا ہر مسلمان مرد و عورت پر فرض ہے۔''(۸)

دوسری حدیث میں ہے۔ (حالانکہ بعض محدثین نے اسے موضوع قرار دیا ہے):

''علم حاصل کرو اگرچہ تمہیں چین جانا پڑے''(۹)

اسلام میں تعلیم گاہ کی خشت اول مسجد نبوی میں بنے ہوئے چبوترے پر رکھی گئی تھی جسے ہم ''صفہ'' کے نام سے جانتے ہیں۔ وہاں بھی علم کی جامعیت کا تصور پیش کیا گیا تھا۔ اصحاب صفہ نہ صرف قرآن حفظ کرتے اور اللہ کے ارشادات کو سن کر اپنے سینوں میں محفوظ کرتے تھے بلکہ لکھنا پڑھنا بھی سیکھتے اور فنون حرب کی بھی مشق کرتے تھے۔

جب غزوہ بدر کے قیدیوں کی رہائی کے لئے فدیہ کی رقم مقرر کی گئی تھی ان میں سے جو نادر تھے وہ بلا معاوضہ ہی چھوڑ دیئے گئے لیکن جو لکھنا پڑھنا جانتے تھے انہیں حکم ہوا کہ دس دس بچوں کو پڑھنا سکھا دیں تو چھوڑ دیئے جائیں گے۔

کاتب وحی زید بن ثابت نے اسی طرح لکھنا سیکھا تھا۔اس بات سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ تعلیم کی کیا اہمیت ہے۔

ب۔

کیا (مطلوبہ) دانشوران اردو مفکر تعلیم تھے؟

اردو کے مفکرین تعلیم کے حوالے سے گفتگو ہم باب سوئم کے تحت کریں گے۔ یہاں صرف ایک سوال جو میرے ذہن میں ہے اس کا جواب دینے کی کوشش کروں گا۔سوال یہ ہے کہ جب ہم اردو کے مفکرین کے افکار و نظریات کا مطالعہ اس لحاظ سے کرتے ہیں کہ ان کے تعلیمی تصورات کا اخراج کیا جا سکے تو کوئی طرح کے سوالات ذہن میں جنم لیتے ہیں۔اس حوالے سے کچھ اقتباسات ملاحظہ کیجئے:

عبدالرزاق فاروقی لکھتے ہیں:

''ایک چیز جو ذہن میں رہنی ضروری ہے وہ یہ ہے کہ ہر مفکر تعلیم کے لئے لازمی نہیں کہ وہ اپنے تصورات کو تعلیمی تصورات کا عنوان دیکر ہی دنیا کے سامنے پیش کرے۔نذیر احمد کا ناول ''توبتہ النصوح'' کوئی تعلیمی فلسفہ پر راست مقالہ نہیں لیکن اس کا مرکزی خیال تعلیمی امور ہی سے متعلق ہے۔ پریم چند کے افکار میں ہم مہاجن ،کاشتکار، زمین دار اور یوپی کے دیہات کے بارے میں کئی چیزیں ڈھونڈتے ہیں اور ایسا محسوس کرتے ہیں کہ پریم چند نے آزادی سے قبل کے ہندوستان کی کشمکش کا بہترین نقشہ کھینچا ہے۔ انہوں نے بچہ کی تربیت اس کا نفسیاتی ارتقا اور بیسیوں تعلیمی خرابیوں کو اپنے کرداروں کے ذریعہ نہاہت وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔(۱۰)

آگے لکھتے ہیں:

''عصمت چغتائی کے ناول ''ٹیڑھی لکیر" شروع سے آخر تک شمن کے نفسیاتی ارتقا کو

پیش کیا گیا ہے۔اسی طرح فرانس کے مشہور فلسفی روسو (Rousseau) نے اے میلی Emile" کے عنوان کے تحت ایک ناول لکھا تھا۔جس میں اے میلی کا کردار اور اس کی بچپن کے حالات اور اس کی تربیت وغیرہ کا نقشہ کھینچا تھا۔ یہی نقشہ بعد میں روسو کا نظریہ تعلیم قرار پایا۔"(۱۱)

بہت سے ایسے دانشور، ادیب، مفکر اور فلاسفر گزرے ہیں جنہوں نے اپنی زندگی میں کچھ بھی نہیں لکھا اور لکھا بھی تو کسی خاص موضوع اور عنوان کے تحت نہیں لکھا۔سقراط جو اپنے وقت کا عظیم فلاسفر اور جلیل المرتبت معلم تھا انہوں نے کبھی کوئی کتاب نہیں لکھی۔ کسی مخصوص موضوع کو صفحہ قرطاس نہیں بنایا۔اسی طرح pytthgoras (فیثاغورث) جو عظیم ریاضی داں کے ساتھ ساتھ عظیم مفکر بھی تھا۔لیکن انہوں نے بھی کوئی تحریر نہیں لکھی۔ پھر بھی ان کے نظریات کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔

عبدالرزاق دوسری جگہ لکھتے ہیں:

" 1857 کے بعد ہی سے اردو ادب میں جو مقصد نگاری کے تحت ادب اور شاعری کا استعمال شروع ہوا تو سماج کے کئی امور کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا گیا۔نتیجہ کے طور پر تعلیم سے متعلق موضوعات بھی ہمارے ادیبوں اور شاعروں کے دلچسپ بلکہ اہم ترین موضوع رہے ہیں لیکن یہ بات یاد رکھنی ضروری ہے کہ اکثر اس میں ایسے ہیں جنہوں نے اپنے افکار کو اصل موضوع کے تحت پیش نہیں کیا۔مثلاً اردو ادب کے اولین ناول نگار نذیر احمد نے جو ناول نگاری شروع کی وہ دراصل تعلیم ہی سے متعلق تھی۔ان کے ناول کم اور تربیت کے ذرائع زیادہ ہیں۔گوفن تعلیم کی گونا گوں بحثوں کو ہم ان ناولوں میں نہیں پاتے۔لیکن راست ان کا تعلق تعلیمی امور ہی سے ہے۔اسی طرح ہمیں بیشتر شاعر و ادیب ایسے ملتے ہیں جنہوں نے افکار میں اس دور کے تعلیمی نظام اور اخلاقی نظام کا جائزہ لیا ہے۔سرسید، حالی، شبلی اور اکبر اور پھر اقبال کے یہاں یہ نظریات واضح نظر آتے ہیں۔ اسی طرح یہ

روائتی طور پر ماہر تعلیم نہ ہوتے ہوئے بھی ہمیں وہ سب کچھ بتلاتے ہیں جس کی وجہ سے ہمارے تعلیمی نظام میں برائیاں پیدا ہوئی تھیں۔(۱۲)

سر سید احمد خان نے بھی تعلیم کے اصول ونظریات پر کوئی کتاب نہیں لکھی لیکن یہ بات سب کو پتا ہے کہ انہوں نے جدید تعلیم، نصاب تعلیم، مذہبی تعلیم، تعلیم نسواں وغیرہ پر اپنے افکار ونظریات کو ظاہر کیا۔اور اسی وجہ سے وہ مفکرین تعلیم کی صف میں شامل ہوتے ہیں۔

نورالحسن نقوی لکھتے ہیں:

''اپنے سوانح نگار حالی کے قول کے مطابق سر سید باضابطہ ماہر تعلیم نہ ہونے کے باوجود تعلیمی مسائل پر اپنی توجہ صرف کرتے تھے کہ اس موضوع پر انہوں نے جو کچھ کہا اوراس سلسلے میں جو کچھ لکھا ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ میں اسے ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ان کے ہمہ جہتی کاموں اور کارناموں میں جو چیز سب سے زیادہ اہم ہے وہ ان کا تصور تعلیم اوراسے فروغ دینے کے لئے ان کی جدوجہد ہے۔''(۱۳)

خواجہ غلام السیدین مولانا آزاد کے معلم اور ماہر تعلیم ہونے کے سلسلے میں ایک بڑے پتے کی بات کہی ہے۔ انہوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ مولانا آزاد ایک معلم ماہر تعلیم اور فلسفی بھی تھے۔خواجہ صاحب لکھتے ہیں:

''معلم اور ماہر تعلیم کا لفظ دو معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ایک تو وہ لوگ جو تعلیم کے اصولوں اور نظریوں کا باقاعدہ مطالعہ کرتے ہیں اور اسکولوں کالجوں میں اس کا عملی تجربہ حاصل کرتے ہیں۔ان کو تعلیم کا فنی ماہر سمجھا جا سکتا ہے۔دوسرے وہ لوگ جن کو قدرت نے ایک خلاق فکر دیا ہے جو فلسفہ، مذہب، سیاست میں گہری نظر رکھتے ہیں۔ جو جانتے ہیں کہ دنیا میں انسان کا کیا مقام ہے اور جن کی انگلیاں انسان کی زندگی اوراس کے امکانات کی نبض پر رہتی ہیں۔ یہ لوگ زندگی کو نئی قدروں اور نئی سمتوں سے روشناس کرتے ہیں اور تعلیم کو ان کے حصول کا

ایک ذریعہ بنانا چاہتے ہیں۔ ان کے ذہن میں زندگی کی ایک حسین اور واضح تصویر ہوتی ہے۔ ماضی کی بنیادوں پر قائم حال کے تقاضوں سے آشنا اور مستقبل کی طرف نگراں جس میں ان کا تخیل دلکش رنگ بھرتا ہے اور کبھی کبھی ان کو یہ سعادت بھی نصیب ہوتی ہے کہ وہ اسے عمل میں لانے کے لئے جدوجہد کریں۔ ۔۔۔۔۔مولانا آزاد کا شمار انہیں عصر آفریں معلموں میں ہے۔'' (۱۴)

یہ چند اقتباسات تھے جن کی روشنی میں ہم نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہمارے اردو کے مطلوبہ دانشوران مفکر تعلیم بھی تھے اور ماہر تعلیم بھی۔ فلسفی بھی تھے اور معلم بھی یہ اور بات ہے کہ انہیں اصطلاحی معنی میں ماہر تعلیم قرار نہیں دیا جا سکتا یا فلسفی نہیں کہے جا سکتے، لیکن جب ہم ان مفکرین کے بلیغ افکار اور عظیم رہنمائی کے گراں قدر کارناموں کا مطالعہ کرتے ہیں تو ان کے یہاں ہم تعلیمی فلسفے کی تشکیل کا نمایاں حصہ پاتے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ساجد جمال،عبدالرحیم ،ابھرتے ہوئے ہندوستانی سماج میں تعلیم ،شپرا پبلی کیشنز، دہلی، 2017 ص8

۲۔ ڈاکٹر آفاق ندیم سید معاذ حسین، تعلیمی نفسیات کے پہلو،ایم کے آفسیٹ پرنٹرس، دہلی، 2017،ص32

۳-ڈاکٹر ضیاالدین علوی، اصول تعلیم ."ایجوکیشنل بک ہاؤس،علی گڑھ، 2017 ص14

۴۔ایضاً ص11

۵۔ساجد جمال،عبدالرحیم ،ابھرتے ہوئے ہندوستانی سماج میں تعلیم ،شپرا پبلی کیشنز، دہلی، 2017 ص19

۶۔القرآن،سورہ انبیا-آیت نمبر ۷

۷۔القرآن،سورہ الزمر،آیت نمبر ۹

۸۔امام غزالی، احیاء العلوم،جلد1،ص8-9

۹۔ایضاً ص9-8

۱۰۔عبدالرزاق فاروقی ،ابوالکلام آزاد کے تعلیمی تصورات ،عماد پریس چھتہ بازار،حیدرآباد 1985 ص41

۱۱-ایضاً ص41

۱۲-ایضاً ص39-38

۱۳۔نورالحسن نقوی، سرسید اور ہندوستانی مسلمان ،ایجوکیشنل بک ہاؤس،علی گرھ، 2012،ص:109

۱۴۔پروفیسر عبدالستار دلوی،مولانا ابوالکلام آزاد: ایک مطالعہ،قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی، 2015،
ص140۔141

باب دوم

انیسویں وبیسویں صدی کے ہندستان کے سیاسی، تہذیبی اور تعلیمی حالات

ہندوستان کی تاریخ ہزاروں سال پرانی ہے۔ یہ ایک کثیر ثقافتی ملک ہے جو کئی خصوصیات جیسے مختلف زبانوں، تہواروں، مذاہب، رقص، موسیقی، فن تعمیر اور پکوان وغیرہ سے جانا جاتا ہے۔ ہڑپا اور موہن جو داڑو تہذیب دنیا کی قدیم ترین تہذیبوں میں شمار ہوتی ہیں، یہاں کی زرخیزی، غلے کے ڈھیر اور زر و جواہرات کے خزانوں کی جھنکار ہمیشہ بیرونی حملہ آوروں اور اقوام کے لئے باعث کشش رہی ہے۔ بھارت کی سرزمین پر کبھی پرتگالیوں نے ڈیرے ڈالے تو کبھی ڈچ کی آمد ہوئی تو کبھی فرانسیسیوں نے پیروں کو جمایا۔ کبھی مسلم حکمرانوں نے سلطنتیں قائم کیں تو کبھی انگریزوں نے حکومت کی، گویا ہندوستان میں مختلف نسلوں، خاندانوں نے اپنا اثر چھوڑا، اپنی تہذیبیں اور ثقافتیں چھوڑیں اور اس طرح ہندوستان رنگا رنگی تہذیب و تمدن، ادب و ثقافت اور قومی یکجہتی کا گہوارہ بن گیا۔

ہندوستان دنیا کا ایسا خطہ ہے جہاں آٹھویں صدی سے لے کر بیسویں صدی تک دو غیر ملکی حکمران عرب مسلمان اور انگریز قابض رہے 712 میں مسلم حکمران محمد بن قاسم نے ہندوستان میں قدم رکھا اور 1857 کے غدر کے بعد باقاعدہ مسلمانوں کے اقتدار کا خاتمہ ہوا۔ برطانوی سامراج جس کی ابتدا 1757 میں ہوئی تھی کا خاتمہ 1947 میں ہوا۔

ہندوستان میں باضابطہ مسلم حکومت کا آغاز سلطنت دہلی سے ہوتا ہے۔ ۱۲۰۶ سے ۱۵۲۶ تک دہلی سلطنت کے کئی بادشاہوں نے حکومت کی۔ پھر ۱۵۲۶ میں بابر کے ہاتھوں مغلیہ سلطنت کا آغاز ہوا اور یہ حکومت لگ بھگ سوا تین سو سال کے بعد ۱۸۵۷ میں ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد ہندوستان پر انگریز قابض ہوئے اور آخر کار 1947 میں

انگریزوں کی حکومت بھی ختم ہو جاتی ہے۔اس طرح ہندوستان سامراجی حکومتوں سے نکل کر جمہوری حکومت میں داخل ہو جاتا ہے۔یہی وہ دور ہے جب ہندوستان میں سماجی ، معاشی اور مذہبی طور پر کئی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ان سماجی اورسیاسی تبدیلیوں کا اثر تعلیم پر ہوتا ہے اور ٹھیک اسی طرح تعلیمی تبدیلی کا اثر سماج پر ہوتا ہے۔نیز یہ کہ مختلف قومیں جب کسی علاقے میں مستقل سکونت اختیار کر لیں تو وہ قومیں ایک دوسرے کی تہذیب وثقافت اور تعلیم وتمدن کو قبول کرتی ہیں۔ڈاکٹر اطہر حسین لکھتے ہیں:

''اسلامی دور کی اہم خصوصیات میں جو سب سے دیرپا ثابت ہونے والی بات تھی وہ اسلامی تمدن کا ہندوستانی سماج پر اثر اور ہندوستانی رسم ورواج کا مسلمانوں پر اثر -اولین فاتحین نے ہندوستانی تمدن اور طرز تعلیم کو اپنانے میں عار نہیں سمجھا۔ یہی وجہ ہے کہ آگے چل کر انڈو اسلامک کلچر کا فروغ ہوا۔سلطنت دہلی کے سبھی خاندان غلام، خلجی، تغلق اور لودھی سبھی نے اسلامی تعلیم کو عام کرنے کوشش تو کی لیکن یہاں کے تعلیم وتمدن کا اثر بھی قبول کیا۔''(۱)

آگے لکھتے ہیں۔

''مغلیہ سلطنت کے قیام تک ایک نئی ہندوستانی گنگا جمنی تہذیب جنم لے چکی تھی۔ اردو زبان اسی کی دین ہے۔''(۲)

مسلم دور حکومت میں مدارس کا رواج تھا جہاں ہندوستانی زبانیں اور دیگر علوم جیسے ریاضی،سماجی علوم دینیات کی تعلیم دی جاتی تھی۔ البتہ کچھ بڑے شہروں میں تعلیم کے اعلیٰ مراکز قائم تھے جن میں دینیات، ادبیات، فقہ، احادیث، علم نجوم،فلکیات،علم طب،علم ریاضی اور بعض مدارس میں جنگی ساز وسامان، تیغ زنی کے مہارت پر مبنی تعلیم اور باغبانی سے متعلق مہارتیں شامل تھیں۔

ہندوستان میں مسلمانوں کا دور حکومت تقریبا 800 سال رہا ہے۔ یہاں ایک سوال ذہن میں ابھرتا ہے کہ مسلم حکمران اپنے دور حکومت میں تعلیم کے تئیں کتنے حساس تھے؟ انہوں نے کتنے علوم کو فروغ دیا اور کتنے ادارے کھولے؟ اس حوالے سے کچھ لوگوں کا ماننا ہے کہ مسلم حکمرانوں نے مدارس کی شکل میں کافی تعلیمی ادارے قائم کئے،علم وہنر کو فروغ دینے میں یکساں طور پر دلچسپی دکھائی۔جیسا کہ ڈاکٹر اطہر حسین لکھتے ہیں:

''تاریخ شاہد ہے کہ اولین سلطان محمد غوری نے اجمیر میں مساجد کے ساتھ ساتھ اسکول بھی قائم کیئے اور اس کے جانشیں قطب الدین ایبک، التمش، رضیہ، بلبن وغیرہ سبھی نے مساجد کے ساتھ ساتھ مکتب اور مدرسوں کو تعمیر کرائے۔ تعلیم کو عام کرنے میں فیروز شاہ تغلق نے اہم کردار نبھایا''(۳)

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

''مغل شہنشاہ جہانگیر نے تعلیم کی ترویج کے لئے ایک قانون وضع کیا تھا۔ جس کے مطابق کسی بھی لاوارث یا مالدار و مسافر کی موت کے بعد اس کی جائداد اسکولوں اور مساجد کی مرمت پر خرچ کی جائے گی۔ اسی کے زمانے میں دلی اور اطراف دلی کئی مدارس و مکاتب تعمیر کیئے گئے۔ شاہ جہاں نے دلی جامع مسجد کے قریب ایک جامعہ کی تعمیر کرائی تھی۔''(۴)

لیکن کچھ لوگ اس کے برخلاف ہیں۔ ان کا ماننا ہے کہ مسلم حکمرانوں نے تعلیم میں کوئی دلچسپی نہیں دکھائی۔ البتہ محدود پیمانے پر مدارس و مکاتیب کھولے لیکن اعلیٰ تعلیم اور جدید تعلیم کے لئے انہوں نے کوئی خاص قدم نہیں اٹھایا۔ مسلم حکمرانوں کے ایک ہزار سالہ دور حکومت میں تعلیمی ماحول کے لئے کبھی بھی مربوط اور منصوبہ بند سرگرمی نہ رہی۔

ارشد محمود لکھتے ہیں:

یہ کہنا غلط ہے کہ ہندوستان میں مسلم حکمرانوں نے تعلیم میں کوئی باقاعدہ دلچسپی لی۔ ان کے بنائے قلعے، محل باغات اور مقبرے تو آج بھی دکھائی دیتے ہیں لیکن اسکول کالج، لائبریریاں یا تحقیقی اداروں کا نشان بھی نہیں ملتا۔ مسجدوں سے ملحقہ مکتبے یا دوسرے پرائیویٹ مدرسے غیر منظّم طریقے سے چلتے رہے۔ حکمران خاندان کے لئے خصوصی اتالیق مقرر کر دیئے جاتے۔ تعلیم کا مقصد علم کا حصول نہیں بلکہ صرف نقل نویسی تھا۔ مغل یا دیگر مسلمان حکمرانوں نے کوئی ایسا تعلیمی نظام وضع نہ کیا جس سے کوئی ثقافتی انقلاب برپا ہو اور معاشرے مادی ترقی کا

باعث بنتا۔''(۵)

اسی طرح ڈاکٹر محمد آصف اعوان لکھتے ہیں:

یہ ٹھیک ہے کہ مغل فرماں رواؤں نے عمارتیں اور قلعے تعمیر کروائے۔مقبرے اور مسجدیں بنوائیں، ہمایوں کا مقبرہ،سکندرہ میں اکبر کا مقبرہ، آگرہ کی جامع مسجد اور قلعہ،مقبرہ تاج محل، دہلی کا لال قلعہ اور جامع مسجد، لاہور میں جہانگیر کا مقبرہ اور بادشاہی مسجد۔تاہم سوچنے کی بات ہے کہ مغلیہ دور میں کتنی جامعات اور دانش کدے تعمیر ہوئے۔ قوم کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کرنے اور مستقبل کے چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لئے کیا منصوبہ بندی کی گئی۔کتنے جابر بن حیان، بوعلی سینا، فارابی، کندی، ابن ماجہ، ابن الہیثم ابن مسکویہ اس عہد نے پیدا کئے۔(۶)

جدید ہندوستان

بنیادی طور پر جدید بھارت کی شروعات مسلم حکمرانوں کے دورحکومت کے خاتمے کے بعد ہوتی ہے ہے۔ 1857 میں مغلیہ سلطنت کا چراغ پوری طرح بجھ جاتا ہے۔ اور بھارت میں نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ انگریز جو تجارت کی غرض سے ہندوستان آئے تھے وہ بادشاہوں کے عہدے پر جا بیٹھتے ہیں۔ اور پورے بھارت کا مستقبل، بھارت کا قانون برطانوی حکومت کے اختیار میں آجاتا ہے۔

انگریزوں کا بنگال پر تصرف/ جنگ پلاسی

جنگ پلاسی وہ جنگ ہے جسے برصغیر میں برطانوی حکومت کی سنگ بنیاد سمجھا جاتا ہے۔ یہ جنگ 23 جون 1757 کولڑی گئی تھی۔ بنگال پر ان دنوں نواب سراج الدولہ کی حکمرانی تھی۔انگریزوں نے جن کی قیادت لارڈ کلائیو کر رہا تھا، سراج الدولہ کے کئی امرا اور سپہ سالار میر جعفر کو لالچ دے کر اپنے ساتھ ملا لیا۔ 23 جون 1757 کو پلاسی کے میدان میں انگریزوں اور سراج الدولہ کے درمیان فیصلہ کن جنگ ہوئی۔ سراج الدولہ کی فوج کا ایک بڑا حصہ جس کی قیادت میر جعفر کر رہا تھا۔ لاتعلق کھڑا رہا۔ اور آخر کار سراج الدو کی شکست ہوئی اور وہ مارا گیا۔

ریاست میسور پر قبضہ

سراج الدولہ کی شکست اوران کے مارے جانے کے بعد انگریزوں کے حوصلے بلند ہو گئے تھے۔لہٰذاانہوں نے ہندوستان کے دوسری ریاستوں کا رخ کیا۔ بنگال پر تصرف کے بعد میسور پر قبضہ کرنے کی کوشش کی لیکن اتنی آسانی کے ساتھ اس ریاست پر قابض ہونا نہایت ہی مشکل تھا۔ کیونکہ ریاست میسور ہندوستان کے سپوت حیدرعلی کے اختیار میں تھا،حیدرعلی کے ہاتھوں انگریزوں کوکئی بارشکست کا سامنا کرنا پڑا۔ بالآخرانگریزوں نے حیدر کے بیٹے ٹیپوسلطان کے خلاف مرہٹوں اور نظام حکومت کومتحد کر کے جنگ لڑی اور کامیاب ہو گئے۔ٹیپوسلطان کی شکست ہوئی اور وہ مارے گئے ٹیپو کی شکست میں بڑا ہاتھ اس کے وزیر میر صادق کا تھا جو انگریزوں سے ساز باز کر کے ٹیپوکوشکست دینے اور مارنے میں کامیاب ہو گیا۔ٹیپو کے مرنے کے بعد لارڈ ولزلی نے خوشی سے چیخ کر کہا تھا کہ:

''اب ہندوستان ہمارا ہے''۔

ریاست میسور پر قبضہ کے بعد دوسری ریاستوں پر چڑھائی کے راستے ہموار ہو گئے انگریزوں نے میسور پر قبضہ کے بعد پنجاب کو اپنی حکومت میں شامل کر لیا۔ پھر ریاست اودھ اور دہلی پر پوری طرح سے قابض ہو گئے۔ساتھ ہی دکن،حیدرآباد، کرناٹک،سورت،فرخ آباداور جھانسی کوبھی فتح کرلیا۔دیکھتے ہی دیکھتے انگریزں نے پورے ہندوستان کو اپنے قبضے میں لے لیا اور اس طرح انگریزوں نے مشرق ومغرب اور شمال وجنوب کے ہر حصے میں فتح کے جھنڈے گاڑ دیئے۔

1857 میں جنگ آزادی لڑی گئی جو نا کام رہی۔انگریزوں نے 1857 کی جنگ آزادی کو غدر کا نام دیا اور اس کی ساری ذمہ داری مسلمانوں پر تھونپ دی۔ ہندووں اور مسلمانوں کے درمیان نفرت کی دیوار کھڑی کردی۔ ہندووں کو اپنے ساتھ ملایا اور مسلمانوں کو سیاسی سماجی، معاشی اقتصادی اور تعلیمی اعتبار سے کمزور کرنے کی سازشیں رچیں۔مسلمانوں کے ساتھ تحقیر آمیز سلوک اور تعلیمی ومعاشی استحصال تو ایک طرف انگریزوں نے جنگ کے انتظام کے جوش میں مسلمانوں کے خون کی ندیاں بہائیں۔انہوں نے ہندوستانیوں اور خصوصاً مسلمانوں کے ساتھ بہیمانہ سلوک کیا جسے تاریخ کبھی نہیں بھلاسکتی۔غدر کے بعد مسلمانوں کا مسلمان ہونا ہی ایک جرم تھا۔اس زمانے کی عکاسی کرتے ہوئے اکبرالہ آبادی نے کہا تھا:

رقیبوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں
کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں

1857 کے بعد پورا ہندوستان خصوصاً مسلمان ہر اعتبار سے پریشان تھے۔مسلمانوں کو ان کے عہدے سے معزول کر دیا گیا۔ان کی عزت وقار کو خاک میں ملا دیا گیا۔جس قوم نے ہندوستان میں ہزار سالہ حکومت کی ہو ان کے ایسے دردناک اور پریشان کن دن آئیں گے حیران کن تھا۔مسلمان اپنے کھوئے ہوئے وقار پر پشیماں تھے۔ ایسے میں سرسید نے مسلمانوں کو ایک راہ دکھائی۔ وہ تھا علم کا راستہ اور جدید علوم کا حصول۔لہٰذا سرسید نے سارا زور جدید تعلیم کے حصول پر دیا۔حالانکہ سرسید کو اس کے لئے بہت کچھ سننا اور دیکھنا پڑا۔سرسید پر کافرو ملحد ہونے کے فتوے لگے۔لیکن سرسید کو ان باتوں سے زیادہ فرق نہیں پڑا۔ان کے ساتھ دینے والوں کا ایک کارواں بنتا گیا۔اگر چہ ان کی مخالفت میں پوری ایک جماعت تھی جو ان کے نظریات وعقائد اور تصورات کو نہیں مانتی تھی۔

برطانوی عہد میں تعلیم

چارٹرا یکٹ۔۱۸۱۳

1857 کے بعد انگریز بھارت پر پوری طرح سے قابض ہو گئے۔اب ان کے سامنے کئی مسائل تھے۔ان میں ایک مسئلہ تعلیم کا بھی تھا۔انہوں نے تعلیم سے متعلق ایکٹ پالیسیاں اور کمیشن بنائے۔ایسٹ انڈیا کمپنی کے قیام کے بعد برطانوی تعلیم کے دور کا آغاز ہوجاتا ہے اور باضابطہ 1813 میں پہلے چارٹرا یکٹ سے ہندوستان میں جدید تعلیم کا نیا دور شروع ہوا۔ایسٹ انڈیا کمپنی کو برطانوی پالمینٹ کی جانب سے ہر بیس سال میں ایک چارٹر بھیجا جاتا تھا۔اس ایکٹ کے تحت ہندوستانی تعلیم کے لئے ایک لاکھ روپے مختص کئے گئے تھے۔لیکن اس ایکٹ کی وجہ سے لوگوں میں اختلاف ہو گیا۔کچھ ہندوستانی روایتی تعلیم کے قائل تھے اور کچھ لوگ جدید تعلیم کے۔جدید تعلیم کے حامی میں راجہ رام موہن رائے بھی تھے۔وہ انگریزی کو ذریعہ تعلیم بنانے کے خواہاں تھے اور مغربی علوم کو ترجیح دیتے تھے۔

چارٹرا یکٹ 1813 کے بعد 1833 میں ایک نیا چارٹر آیا جس میں تعلیم کے خرچ کے لئے 10 لاکھ مختص ہوئے تھے۔لارڈ میکالے کو اس رقم کو تعلیم پر خرچ کرنے کے لئے بھیجا گیا۔لارڈ میکالے مغربی علوم کے دلدادہ تھے اور مغربی تعلیم کو مشرقی تعلیم پر فوقیت دیتے تھے۔انہوں نے ''ڈاؤن وارڈ فلیٹریشن تھیوری'' پیش کی جس کے مطابق اونچے

طبقوں کوتعلیم مہیا کرانے سے دھیرے دھرے تعلیم نچلے طبقوں تک پہنچ جاتی۔ وہ ایسی تعلیم کے قائل تھے جونسلاً ہندوستانی اورعقلاً انگریز ہو۔انہوں نے انگریزی زبان وادب کی تعلیم اورانگریزی میڈیم سے تعلیم کی پرزورحمایت کی۔

Wood's Despatch 1854

(وڈس ڈسپیچ1854)

وڈس ڈسپیچ کوسن 1854 میں لایا گیا تھا۔ ووڈ ڈسپیچ نے جن خاص باتوں کی طرف توجہ دلائی تھی ان میں ہر صوبہ میں ایک مستحکم تعلیم کے قیام کی بات کی تھی۔عوامی تعلیم پرزوردینے ،تعلیم کے لئے مالی امداد کا ایک الگ نظام قائم کرنے ،اساتذہ کی تربیت کے لئےخصوصی اداروں کا انتظام کرنے اورتعلیم نسواں پرخصوصی زوردینے کی بات کہی تھی۔ لیکن اس پر پوری طرح سے عمل نہیں کیا جاسکا کیونکہ 1857 کا حادثہ پیش آ گیا تھا۔تاہم اس کے شفارش کے مطابق انڈیا میں 1857 میں تین یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا جن میں ممبئی یونیورسٹی،کلکتہ نیو یورسٹی اور مدراس یونیورسٹی شامل ہیں۔

1882 میں ہنٹرکمیشن لایا گیا۔اس کمیشن نے پرائمری تعلیم پرخصوصی توجہ دلائی۔ساتھ ہی اسکول کی عمارت، فرنیچر،اساتذہ کی تربیت اور مالیات وغیرہ پربھی بات کی۔

یونیورسٹی ایکٹ1904(لارڈ کرزن کی تعلیمی پالیسی)

1890 میں لارڈ کرزن گورنر جنرل بنے جس نے ہندوستانی تعلیم کوازسرنوتعمیرکیا۔اس ایکٹ کےتحت انڈین یونیورسٹی نظام کوتشکیل دیا گیا۔کمپنی نے خصوصی طور پر پانچ نکات کی سفارشات پیش کیں جس میں یونیورسٹی کےنظم ونسق کوازسرنوتعمیر کرنا، کالجوں اور یونیورسٹیوں کی سختی کے ساتھ اورمنظّم انداز میں نگرانی کرنا۔ طالب علموں کو رہنے اور کام کرنے کے حالات کی طرف زیادہ توجہ دینا، نصاب اورانتظام کے طریقوں میں تبدیلی لانا شامل تھا۔ لارڈ کرزن نے کئے دیگر شعبے قائم کروائے جن کا مقصد آرٹ، کرافٹ، زرعی تعلیم اورثانوی تعلیم کوبہتر بنانا تھا۔

پھر گاندھی جی نے 1937 میں بنیادی تعلیم یاواردھا تعلیمی اسکیم کا تصور دیا جس کے مطابق طلبا کو پڑھائی کے ساتھ ساتھ صنعت وحرفت کے ہنر سے بھی لیس ہونے کو ترجیح دی گئی۔

آزادی کے چند سالوں بعد ہی تعلیم کے حوالے سے کئی کمیٹیوں اور کمشنوں کو وجود میں لایا گیا۔ 66-1964 میں تعلیمی کمیشن یا کوٹھاری کمیشن کو عمل میں لایا گیا۔ 1952,53 میں سکنڈری ایجوکیشن کمیشن، 1986 میں قومی تعلیمی پالیسی (NPE) اور 1990 میں یش پال کمیٹی آئی۔ سب تعلیمی کمیشنوں اور کمیٹیوں کا مقصد تعلیم کو بہتر بنانا، انڈیا کی شرح خواندگی کو بڑھانا، تعلیم نسواں اور تعلیم بالغان پر خصوصی توجہ دینا، زرعی وحرفتی اداروں اور سائنس وٹکنالوجی اداروں کو فروغ دینا تھا۔ تہذیبی، ثقافتی، سماجی، فنون لطیفہ کے اداروں اور اکیڈمیوں کو جگہ جگہ کھولنا، اپنے ورثہ کو محفوظ رکھنے اور فروغ دینے میں شامل تھا۔

حوالہ جات

۱۔ڈاکٹرمحمداطہرحسین، ہندوستان میں تعلیمی ترقی کا تاریخی جائزہ: مسائل اوران کاحل، مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ،نئی دہلی، جولائی 2018،ص28

۲۔ایضاً ص28

۳۔ایضاً ص28

۴۔ایضاً ص29

۵۔ارشدمحمود،تعلیم اور ہماری قومی الجھنیں،(ناشر-نامعلوم)،ص22

۶۔ڈاکٹرآصف اعوان،مغربی تہذیب کے مشرقی نقاد(اکبرالہ بادی واقبال)علی پرنٹرز-لاہور،ص:20

باب سوم

اردو کے مفکرین تعلیم اوران کی ادبی خدمات

بیسویں صدی کے حوالے سے

مولانا ابوالکلام آزاد

حیات زندگی

مولانا ابوالکلام آزاد کی تاریخ پیدائش کے حوالے سے اختلاف ہے۔کسی نے ان کی تاریخ پیدائش ۱۷/ ۱۸ اگست 1888 کو بتایا۔کسی نے 22 اگست 1888 کہا۔ویکیپیڈیا اور دیگر چند کتابوں میں ان کی تاریخ پیدائش 11 نومبر 1888 ہے۔لیکن مالک رام کے مطابق " مولانا آزاد ۹ (نو) اگست سے 6 دسمبر 1888 کے درمیان کسی دن پیدا ہوئے اور ۱۱ نومبر 1888 ان کی تاریخ ولادت نہیں ہے۔''(۱)

مولانا آزاد ہندوستان کے پہلے وزیرِ تعلیم تھے۔ان کا اصل نام محی الدین احمد تھا۔ان کے والد محمد خیر الدین انہیں فیروز بخت کہہ کر پکارتے تھے۔وہ کہتے ہیں:

''والدمرحوم نے تاریخی نام فروز بخت آ رکھا تھا۔اور مصرع ذیل سے ہجری کا استخراج کیا تھا۔

جواں بخت و جواں طالع ، جواں باد "(۲)

مولانا آزاد مکہ معظّمہ میں پیدا ہوئے۔والدہ کا تعلق مدینہ منورہ سے تھا۔ان کا نام عالیہ بیگم تھا۔" آپ کے بزرگ ہرات کے رہنے والے تھے جہاں سے وہ بابر کے زمانے میں ہندوستان میں آئے۔شروع میں وہ دارالخلافہ آگرہ میں رہے اور بعد کو غالباً اکبر کے عہد میں نقل مکانی کر کے دلی چلے آئے (۳)

1857 کے غدر میں آزاد کے والد کو ہندوستان سے ہجرت کرنا پڑی۔کئی سال عرب میں رہے۔مولانا کا بچپن مکہ معظّمہ اور مدینہ منورہ میں گزرا۔ابتدائی تعلیم والد سے حاصل کی۔آپ کے والد ایک صوفی بزرگ تھے۔سلسلہ نقشبندیہ اور قادریہ سے تعلق رکھتے تھے۔مولانا آزاد کی تین بہنیں اور ایک بڑے بھائی ابوالنصر غلام یسین آہ تھے۔

مولانا نے ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی۔انہوں نے اپنے والد سے گلستاں ، بوستاں ، میزان ومنشعب اور دیگر کتابیں پڑھیں پھر ان کے والد نے مولوی محمد یعقوب کو اپنے بچوں کی تعلیم کے لئے متعین کیا۔ان سے مولانا آزاد نے شرح وقایہ کنز الدقائق ، ہدایہ، مشکٰوۃ اور جلالین وغیرہ پڑھی۔

مولانا آزاد چودہ یا پندرہ سال کی عمر میں درس نظامی کو مکمل کر چکے تھے۔اسی پندرہ کی عمر میں وہ ایک جید عالم اور بہترین استاد بن چکے تھے۔سرسید احمد خان کے چند مضامین پڑھنے کے بعد وہ انگریزی اور مغربی تعلیم سے متاثر ہوئے۔اور اپنے شوق سے انگریزی زبان ، دنیا کی تاریخ اور سیاست وغیرہ کا بھی علم حاصل کیا۔وہ گیارہ سال کے تھے

تو ان کی ماں کا انتقال ہو گیا اور دو سال بعد یعنی تیرہ سال کی عمر میں ہی وہ رشتہ ازدواج سے منسلک ہو گئے اور ان کی شادی زلیخا بیگم سے ہوئی۔ مولانا آزاد نے مصر، ترکی، فرانس کا دورہ کیا اور فرنچ زبان بھی سیکھی۔ مولانا بیک وقت عمدہ انشا پرداز، جادو بیان خطیب، بے مثال صحافی اور ایک بہترین مصنف و مفسر تھے۔

مولانا آزاد بھارت کے پہلے وزیر تعلیم رہے اور 15 اگست 1947 تا یکم فروری 1958 اس عہدے پر فائز رہے۔ اس دوران آپ نے تعلیمی میدان میں ایسا کارنامہ انجام دیا کہ ملک کے تعلیمی نظام کی راہیں ہموار ہو گئیں اور ترقی کے دروازے کھل گئے۔ آپ نے اپنے عہد وزارت میں فنون لطیفہ، سائنس، مذہب، آرٹ، سیاست، تعلیم نسواں اور تعلیم بالغاں پر خصوصی توجہ دی۔ آپ کے کام کو سراہتے اور تسلیم کرتے ہوئے بھارتی حکومت نے آپ کو ملک کے سب سے بڑے شہری اوارڈ'' بھارت رتن" (1992) سے نوازا۔ 22 فروری 1958 کو آزاد انتقال کر گئے اور جامع مسجد دہلی میں دفن ہوئے۔

مولانا آزاد کا تصور تعلیم

تعلیم بالغان:

مولانا آزاد کے تصور تعلیم میں پانچ چھ نکات بڑی اہمیت کے حامل ہیں جن پر ان کے تعلیمی نظریات کا انحصار ہے۔ ان میں تعلیم کا آفاقی تصور، تعلیم بالغاں پر زور، ذریعۂ تعلیم اور مغربی علوم، آزاد ہند میں فاصلاتی تعلیم، مدارس اسلامیہ کی تجدید کاری وغیرہ شامل ہیں۔ مولانا آزاد نے وزیر تعلیم بننے سے پہلے ہی اپنی مختلف تحریروں اور خطبات کے اندر اپنے تعلیمی تصور کے متعلق اظہار خیال کیا تھا۔ 29 دسمبر 1935 میں کانپور میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا تھا۔

''ہمار کے لئے ہر حال میں مقدم کام عوام کی تعلیم ہے۔ تعلیم کے لفظ کو اس کے زیادہ وسیع معنی میں لیجئے۔ تعلیم سے مقصود صرف وہ تعلیم نہیں ہے جو قواعد اور منضبط اور اصول کے ذریعے مکتبوں اور مدرسوں میں دی جاتی ہے۔ یہ تو دراصل آنے والے عہد کے لئے ہے جنہیں آج پڑھایا جا رہا ہے وہ کل کام کریں گے۔ لیکن قوم کو اس موجودہ حالت میں بلند کرنے کے لئے ضروری ہے کہ موجودہ نسل کی دماغی حالت اور عملی استعداد درست کی جائے۔ وقت کی تمام مشکلات کا یہی علاج ہے۔'' (۴)

مولانا آزاد کی یہ تقریر تعلیم بالغان کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ تعلیم بالغان میں بالغ افراد کو بنیادی تعلیم دی جاتی

ہے جس سے وہ پڑھنے اور لکھنے کے قابل ہوسکیں۔ ہر ملک کی ترقی کا راز تعلیم میں ہے۔ ہندوستان آج بھی ترقی یافتہ ملکوں کے بالمقابل پیچھے ہے جس کی ایک اہم وجہ بالغ شہریوں کی ناخواندگی ہے کیونکہ کسی بھی جمہوری نظام کی کامیابی کا دارومدار اس ملک کے بالغ افراد کی سمجھ داری پر ہوتا ہے۔ مولانا آزاد کو اس بات کا خوب احساس تھا کہ وہ افراد جو سن بلوغت کو پہنچ چکے ہیں اور تعلیم سے بے بہرہ ہیں انہیں بھی تعلیم ملنی چاہئے۔

ذریعہ تعلیم اور مغربی علوم

مولانا آزاد مادری زبان کے قائل تھے اور غیر مادری زبان میں بچوں کو تعلیم دینا نقصان دہ سمجھتے تھے۔ مادری زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے کی وکالت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ہندوستان میں مغربی تعلیم جو شروع کی جائے تو اس کی رونمائی مادری زبان میں ہو۔ تاکہ جب چہرے کی نقاب اتاری جائے اور علم کا روئے زیبا جب سامنے آئے تو طالب علم کا دل بول اٹھے کہ یہ تو جانی پہچانی صورت ہے" (۵)

مولانا آزاد مادری زبان کو ذریعہ تعلیم بنانا چاہتے تھے اور ہندی زبان کو ضروری سمجھتے تھے لیکن انہیں یہ بھی احساس تھا کہ اعلیٰ تعلیم خصوصاً سائنس وٹکنالوجی کے لئے انگریزی زبان کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ یوروپ وامریکہ سے ربط اور مغربی علوم سے استفادہ کے لئے انگریزی زبان کو ترجیح دیتے تھے۔ خواجہ غلام السیدین لکھتے ہیں:

''مولانا کے تعلیمی فلسفے کا بنیادی خیال یہ ہے کہ مشرق اور مغرب کی نظریوں میں میل پیدا کیا جائے۔ تاکہ انسان سائنس کا صحیح استعمال کرنا سیکھے اور اس کے ذریعے ان مقصدوں کو حاصل کر سکے جو اس کی فطرت کے بہترین تقاضوں کی ترجمانی کرتے ہیں۔'' (۶)

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

''وہ جانتے تھے کہ مغرب سے سبق لے کر ایک سائنٹفک ذہن پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ جس کے بغیر عصر حاضر کے تقاضے پورے نہیں ہو سکتے اور زندگی میں فراوانی نہیں آسکتی۔'' (۷)

مغربی تعلیم کے جواز کا مسئلہ مدتوں ہندوستانیوں میں زیر بحث رہا۔ خصوصاً مسلمانوں نے اس تعلیم سے دور

رہنے کی کوشش کی، وجہ یہ تھی کہ مسلمان مشرقیت کے پروردہ تھے اور مشرقی علوم وفنون کی کا رواج ان میں عام تھا۔لیکن پہلی مرتبہ انہیں اپنی زبان اور اپنے علوم ترک کر کے دوسرے علوم اور کوئی دوسری زبان سیکھنا پڑ رہی تھی لیکن ہر موقع پر مولانا اس معاملے میں متوازن رویہ رکھا جو تعصب اور تنگ نظری سے پاک تھا۔ وہ مغربی علوم کی اہمیت کو مسلم مانتے تھے لیکن ساتھ ہی اس بات پر بھی زور دیتے تھے کہ لوگ اپنی تہذیب کی قدروں کو پہچانیں اور اس کے سرچشموں سے فیض حاصل کریں۔

مذہبی تعلیم

مذہبی علوم سے مولانا کا براہ راست تعلق تھا بلکہ ان کے دل ودماغ کے ہر کونے میں اس کی اہمیت کا احساس پیوست تھا لیکن، ملک کے حالات اور مصلحتوں کو دیکھ کر انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ سرکاری طور پر درس گاہوں میں مذہبی علوم کو رائج کرنا مناسب نہ ہوگا۔مگر ان سے بہتر کون سمجھ سکتا تھا کہ مذہب کی سچی روح کو نہ صرف تعلیم بلکہ زندگی کے ہر شعبہ میں رائج ہونا چاہئے۔(۸)

اساتذہ۔قوم کے معمار

ٹیچر کسی بھی قوم اور معاشرے میں معمار کی حیثیت رکھتا ہے۔ٹیچروں کو ہر مذہب اور ہر ملک میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔اس لئے مولانا آزاد نے کہا تھا کہ:

جب تک ہم استادوں کے معیار کو بلند نہ کریں ہم تعلیم کے نظام کو بہتر نہیں بنا سکتے۔(۹)

مولانا آزاد کی شکایت تھی کہ اساتذہ کو وہ حق نہیں ملا جو ملنا چاہئے تھا۔ان کا ماننا تھا کہ اساتذہ ایک موم بتی کی طرح ہیں جن کا کام خود جل کر دوسروں کو روشنی دینا ہے۔

مدارس کے نصاب میں تجدیدیت کے حامی:

مولانا آزاد مدارس کے فرسودہ نظام تعلیم اور قدیم نصاب میں تبدیلی چاہتے تھے۔ مدارس کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ،لیکن مدارس آج کے دور میں بھی قدیم نصاب تعلیم کی وجہ سے ہی پیچھے ہیں،یہی وجہ ہے کہ آزاد مدارس کے نصاب

میں تبدیلی کے خواہاں تھے۔ایک جگہ نہوں نے کہا تھا:

''جن مدرسوں میں آپ نے آج سے پانچ سو برس پہلے قدم اٹھایا تھا۔ان پانچ سو برس کے اندر دنیا بیٹھی نہیں رہی۔ زمانہ بھی چلتا رہا۔ وہ پانچ سو برس کی مسافت طئے کر چکا ہے۔اورآپ وہیں کے وہیں بیٹھے ہیں۔نتیجہ یہ کہ زمانہ اور آپ میں ایک اونچی دیوار کھڑی ہوگئی ہے۔''(۱۰)

گوکہ مدارس میں آج بھی معقولات کی کتابیں پڑھائی جاتی ہیں لیکن آزاد کہتے ہیں کہ یہ وہی چیزیں ہیں جن سے دنیا کا دماغی کارواں دوسو برس پہلے گزر چکا، آج ان کی دنیا میں کوئی جگہ نہیں۔ مدارس میں ذریعہ تعلیم فارسی تھی جس پرانہوں اعتراض جتاتے ہوئے کہا کہ بنیادی اصول یہ ہونا چاہئے کہ ہرفن کی ابتدائی رونمائی مادری زبان میں ہو۔

تعلیم نسواں

سرسید عورتوں کی تعلیم کے معاملے میں مردوں کی تعلیم کوزور دیتے تھے اور وہ کہتے تھے کہ جب باپ، بھائی اور شوہر وغیرہ تعلیم یافتہ ہو جائیں تو خود بخود عورتوں پر ان کا اثر پڑے گا اور وہ مہذب ومعزز بنتی جائیں گی۔لیکن آزاد اس کے برعکس تھے۔ وہ پہلے عورتوں کی تعلیم کو ترجیح دیتے تھے۔ان کا ماننا تھا کہ عورتوں کی تعلیم تابناک اور سنہرے مستقبل کو دعوت دیتی ہے اور انہیں سنوارتی ہے۔ان کی تعلیم کے بغیر کسی بھی قوم اور معاشرہ ترقی نہیں کر سکتے۔ علامہ اقبال بھی تعلیم نسواں کے بڑے حامی تھے۔ وہ عورت کو تمدن کی جڑ قرار دیتے تھے۔اقبال کا کہنا تھا کہ اگر عورت کو تعلیم دی جائے گی تو تمدن کا درخت بارآور ہوگا۔ وہ پھولے گا پھلے گا ورنہ نہیں۔

مولانا آزاد نے اپنی وزارت کے دوران بڑے بڑے کارنامے انجام دیے۔مثلاً انہوں نے بالغوں کی تعلیم کے تصور میں وسعت پیدا کی اور اس میں رنگ بھرا۔مشرقی علوم اور ادب میں ریسرچ کو فروغ دیا،فنون لطیفہ کی ترقی اور ترویج کے لئے اکادمیاں قائم کیں۔ ہندی میں سائنس کی اصطلاحیں بنانے کا کام بڑے پیمانے پر شروع کیا۔ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن قائم کر کے نہ صرف اعلیٰ تعلیم کو زیادہ وسائل بخشے بلکہ یونیورسٹیوں کی آزادی کا تحفظ کیا۔عورتوں کی تعلیم کو مردوں کی تعلیم سے زیادہ اہم ٹھہرایا۔ گویا انہوں نے اپنی فکر کا نقش تعلیم وتربیت کے ہر پہلو پر ثبت کیا۔

مولانا آزاد کا تعلیم کے شعبے میں تعاون:

وزیر تعلیم کی حیثیت سے مولانا آزاد نے ہندوستانی تعلیم کے شعبے میں مندرجہ ذیل تعاون کیا:

۱۔1948 میں یونیورسٹی تعلیمی کمیشن (رادھا کرشنن کمیٹی) کی تشکیل۔

۲-1952 میں ثانوی تعلیمی کمیشن (مدالیر کمیشن) کی تشکیل

۳-1950 میں ICCR کا قیام

۴۔1953 میں سنگیت کلا اکاڈمی کا قیام.

۵۔1954 میں ساہتیہ اکیڈمی اور للت کلا اکیڈمی کا قیام

۶۔1953 میں AICTE کا قیام

۷۔1956 میں UGC کا قیام

۸۔IIT اور IIM کا قیام(۱۱)

مولانا آزاد کی ادبی خدمات

مولانا ابوالکلام آزاد مختلف کمالات وخصوصیات کا منبع تھے۔ان کی ذات وشخصیت علوم وفنون کا مصدر اور مرکز تھی۔علم وفضل دین و افکار، فلسفہ وحکمت ،شعر ونغمہ،تصنیف و تالیف ، خطابت و تقاریر اور صحافت وسیاست ہر فن میں انہوں نے اپنی چھاپ چھوڑی ہے۔

مولانا آزاد کی قلمی شروعات شاعری سے ہوتی ہے۔گیارہ سال کی عمر میں انہوں شعر کہنا شروع کیا تھا۔ یہ ان کے طالب علمی کا زمانہ تھا لیکن 1902 سے 1903 کے آتے آتے انہوں نے شاعری کو الوداع کہہ دیا۔اور شاعری سے ایسے بے تعلق ہوئے کہ پلٹ کر بھی اُس کی طرف نہیں دیکھا۔ یہاں تک کہ لوگ بھول گئے کہ وہ شاعر تھے۔(۱۲)

سب سے پہلے انہوں نے ''ارمغان فرخ'' میں اپنی غزل چھپوائی جو کافی پسند کی گئی اور اور پہلی کامیابی پر انہیں کافی مسرت ہوئی تھی۔ پھر آزاد نے اپنی غزلوں کو دیگر گلدستوں اور رسالوں جیسے خدنگ نظر لکھنؤ،نجات،مخزن،ایڈورڈ گزٹ،نجات،بمبئ اور صحن چمن وغیرہ میں شائع کرایا تھا۔

نثری خدمات کی ابتدا 1901 میں ''المصباح " جاری کر کے کی۔مولا نا ابوالکلام آزاد نے مختلف اوقات میں تین ایسے رسالے جاری کئے جو ادبی نہیں تھے بلکہ خاص مقصد کے تحت نکالے گئے تھے۔ یہ تین رسالے ماہانامہ ''لسان الصدق'' ہفت روزہ ''الہلال'' اور پندرہ روزہ ا''لبلاغ " تھے،ان تینوں رسالوں کے مقاصد بھی الگ الگ تھے۔''لسان الصدق''،'' تہذیب الاخلاق'' کی طرز پر تھا اور اس کا مقصد سرسید کے مقاصد کو فروغ دینا تھا۔اگر کوئی

سرسید کے خلاف کچھ لکھتا تو مولانا اس کا جواب سخت الفاظ میں دیا کرتے تھے۔لسان الصدق میں سیاسی تحریریں نہیں ہوتی تھیں۔لسان الصدق کا پہلا شمارہ نومبر 1903 میں شائع کیا گیا تھا۔اس وقت مولانا کی عمر تقریباً پندرہ سال تھی۔ ہفت روزہ الہلال سیاست کے لئے وقف تھا۔اس کا پہلا شمارہ کلکتہ سے 1912 میں نکلا تھا۔الہلال اس زمانے میں نکلا تھا جب مولانا کی فکر میں ایک انقلاب پیدا ہو چکا تھا اور انگریزوں کی حمایت کے بجائے وہ ان کے سخت مخالف ہو گئے تھے۔البلاغ پندرہ روزہ پر مشتمل رسالہ تھا۔آزاد نے اسے کلکتہ سے ہی نکالنا شروع کیا تھا اور اس کا پہلا شمارہ 1915 میں شائع ہوا تھا۔اس رسالے کا مقصد دینی اور مذہبی باتوں کو فروغ دینا تھا۔ چنانچہ پہلی بار انہوں نے ابلاغ کے صفحات میں ترجمہ،تفسیر اور مقدمہ کا اعلان کیا۔مولانا آزاد کا خیال تھا قرآن کی عام تعلیم کے لئے ترجمہ کافی ہوگا۔ مطالعہ کے لئے تفسیر ضرورت پوری کرے گی اور اہل علم ونظر کے لئے مقدمہ مفید ہوگا۔(۱۳)

خط لکھنا ایک فن ہے۔اردو میں خطوط نگاری کی بنیاد غالب نے ڈالی اور مولانا آزاد کے زمانے تک یہ باضابطہ ایک صنف بن چکی تھی۔آزاد نے بھی خطوط لکھے اور ان کے خطوط کے مجموعے غبار خاطر،تبرکات آزاد،نقش آزاد، کاروان خیال،مکاتب ابوالکلام آزاد کے نام سے منظر عام پر آ چکے ہیں۔مولانا آزاد کا کمال یہ ہے کہ وہ متعدد اسالیب نثر پر قدرت رکھتے تھے اور حسب ضرورت انہیں کامیابی کے ساتھ برتتے تھے۔الہلال اور البلاغ کے اداریے اور مضامین گھن گرج اور پرشکوہ انداز بیان کے متقاضی تھے اور وہاں یہی اسلوب پایا جاتا ہے۔تذکرے کے لئے علمی تحریر کی ضرورت تھی جو وہاں موجود ہے۔غبار خاطر خطوط کا مجموعہ ہے لیکن ان خطوط کے موضوعات الگ الگ ہیں اور موضوع کا تقاضا بھی الگ ہے۔اس لئے موضوع کی مناسبت سے تحریر کے مختلف اسلوب اختیار کئے گئے ہیں۔کہیں عام فہم زبان ہے تو کہیں فارسی آمیز علمی زبان۔(۱۴)

مولانا آزاد اردو دنیا میں بطور صحافی بھی مقبول ومعروف ہیں۔مولانا کے صحافتی دور کا آغاز لگ بھگ دس گیارہ برس کی عمر سے ہی شروع ہو چکا تھا۔انہوں نے کئی ادبی رسالے نکالے اور کئی ادبی سیاسی اخباروں سے ان کا تعلق رہا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا کے لئے یہ صرف شوق کی باتیں نہیں تھیں بلکہ وہ صحافت کا ایک سنجیدہ اور مفید استعمال کرنا چاہتے تھے جو سرسید نے کیا تھا۔مولانا آزاد جن اخبار ورسائل سے وابستہ رہے ہیں ان کی فہرست مندرجہ ذیل ہے:

۱۔نیرنگ عالم ۔ کلکتہ ۱۸۹۹

۲۔المصباح ۔	،،	۱۹۰۰
۳۔احسن الاخبار	،،	۱۹۰۱
۴۔لسان الصدق	،،	۱۹۰۳
۵۔خدنگ نظر	لکھنؤ	۱۹۰۳
٦۔الندوہ	لکھنؤ	۱۹۰۵
۷۔وکیل	امرتسر	۱۹۰٦/۰۷
۸۔دارالسلطنت	کلکتہ	۱۹۰۷
۹۔الہلال	،،	۱۹۱۲
۱۰۔البلاغ	،،	۱۹۱۵
۱۱۔پیغام	،،	۱۹۲۱
۱۲۔الجامعہ (عربی)	،،	۱۹۲۳

مولانا آزاد کی کتابوں، مقالات، مجموعوں، مضامین اور خطوط کی ایک لمبی فہرست ہے جن میں کچھ نام یہ ہیں۔ اعلان الحق، مسلمان عورت، جامع الشواہد فی دخول غیر المسلم فی المساجد، مسئلہ خلافت اور جزیرہ العرب، قول فیصل، خطبات آزاد، نوادر ابوالکلام، ترجمان القرآن، تذکرہ، آزاد کی کہانی خود ان کی زبانی، غبار خاطر، کارواں خیال (خطوط) نقش آزاد (خطوط) تبرکات آزاد (خطوط و مضامین) انبیاء کرام، ارمغان آزاد (کلام اور ابتدائی مضامین) آزاد کی تقریریں، خطبات آزاد، البیرونی اور جغرافیہ عالم، میرا عقیدہ، توحید و شہادت۔ آزادی ہند (انڈیا ونس فریڈم کا اردو ترجمہ) قران کا قانون عروج و زوال وغیرہ۔ ان کے علاوہ بھی دیگر مقالے ہیں جو رسائل کی صورت میں یا مضامین کے مجموعوں کی شکل میں ان کی زندگی میں اور ان کی وفات کے بعد شائع ہوئے، جن کی اہمیت اور قدر و قیمت مسلم ہے۔ عبدالقوی دسنوی لکھتے ہیں:

''مولانا ایک عالم دین، دانشور، ادیب، صاحب طرز انشاپرداز کی حیثیت سے نہایت بلند مرتبہ رکھتے ہیں۔ جوں جوں زمانہ گزرتا جائے گا اور حقائق سامنے آتے جائیں گے ان کی قدر و قیمت میں اضافہ ہوتا جائے گا اور وہ عظیم سے عظیم تر ہوتے جائیں گے۔ (۱۵)

حوالہ جات

۱۔ مالک رام، کچھ ابوالکلام آزاد کے بارے میں، قومی کونسل برائے فروغ اردوزبان نئی دہلی، 2011، ص:24

۲۔ ایضاً ص:22

۳۔ ایضاً ص25

۴۔ مالک رام، تذکرہ خطبات آزاد، ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی، 1985، ص230

۵۔ ڈاکٹر وہاب قیصر، مولانا ابوالکلام آزاد. فکر وعمل کے چندزاویئے، خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ، 2009، ص:172

٦۔ پروفیسر عبدالستار دولوی (مرتب)، مولانا ابوالکلام آزاد: ایک مطالعہ، قوئی کونسل برائے فروغ اردوزبان نئی دہلی۔ 2015، ص166

۷۔ ایضاً ص146۔145

۸۔ ایضاً، ص:150

۹۔ ایضاً ص151

۱۰۔ انور معظم (مرتب): مولانا ابوالکلام آزاد منتخب تحریریں، نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا2012، ص:194

۱۱۔ ساجد جمال، عبدالرحیم ابھرتے ہوئے ہندوستانی سماج میں تعلیم، شپرا پبلی کیشنز، نئی دہلی2017 ص162-161

۱۲۔ عبدالقوی دسنوی، ابوالکلام آزاد ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی، 1987 ص166

۱۳۔ ایضاً ص171

۱۴۔ ویکیپیڈیا، غبار خاطر، سائٹ– http/urm.wikipedia.org

۱۵۔ عبدالقوی دسنوی، ابوالکلام آزاد، ص179

علامہ اقبال

حالات زندگی:

علامہ اقبال 9 نومبر 1877 اور بعض کے مطابق 22 فروری 1877 میں سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ان کے آباواجداد سپرو گوت کے کشمیری برہمن تھے۔لیکن اسلام قبول کر کے سیالکوٹ میں بس گئے تھے اقبال کے والد کا نام شیخ نور محمد تھا جو زیادہ پڑھے لکھے یا خوشحال نہیں تھے لیکن دین دار تھے اور علما کے ساتھ بیٹھتے تھے۔اقبال کی ابتدائی تعلیم مکتب میں ہوئی۔ پرائمری، مڈل اور میٹرک کے امتحانوں میں امتیازی نمبروں سے پاس کر کے وظیفہ کے حق دار ہوئے۔ایف اے کا امتحان اسکاچ اسکول سیالکوٹ سے پاس کر کے بی اے کے لئے گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ لیا۔یہیں ان کی ملاقات ڈبلیو آرنلڈ سے ہوئی۔اقبال نے 1899 میں فلسفہ میں ایم اے کیا اور اسی کالج میں فلسفہ کے پروفیسر مقرر ہوئے 1905 میں وہ مزید تعلیم کے لئے انگلستان چلے گئے اور کیمبرج میں داخلہ لیا۔اقبال کی تین شادیاں ہوئی تھیں۔ پہلی شادی طالب علمی کے زمانہ میں ہی یعنی 1893 میں ایک معزز خاندان خان بہادر عطا محمد کی بیٹی کریم بی بی سے ہوئی تھی جس سے آفتاب اقبال اور معراج بیگم پیدا ہوئے۔ دوسری شادی سردار بیگم سے 1910 میں ہوئی تھی اور تیسری شادی 1913 میں مختار بیگم سے ہوئی۔

اقبال نے کیمبرج اور میونخ یونیورسٹیوں سے فلسفہ میں اعلیٰ ترین ڈگریاں حاصل کیں۔ ایران میں مابعد الطبعیات کا ارتقا کے موضوع پر پی ایچ ڈی کیا۔ پھر انہوں نے لندن سے بیرسٹری کا امتحان بھی پاس کیا۔ملک واپس آ کر وہ گورنمنٹ کالج لاہور کے پروفیسر ہوئے اور ساتھ ساتھ وکالت بھی کرتے رہے۔ بعد میں انہوں نے کالج کی ملازمت چھوڑ دی اور وکالت کو ہی اپنا پیشہ بنالیا۔اقبال 21 اپریل 1938 کو انتقال کر گئے۔

تصور تعلیم

علامہ اقبال نے تعلیم کی فنی اور عملی صورتوں پر غور کیا ہے مسائل تعلیم کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا ہے اور اسے فلسفہ حیات میں مناسب جگہ دی ہے۔تعلیم کے عام معنی و اثرات پر روشنی ڈالی ہے۔اس کے ڈھانچے، اغراض اور معیار کو موضوع گفتگو بنایا ہے۔اپنے عہد کے نظام تعلیم پر تنقیدی نگاہ ڈالی ہے۔ مدرسہ،طلبہ، اساتذہ اور نصاب سب پر اظہار

خیال کیا ہے۔صرف مشرق ہی نہیں بلکہ مغرب کے فلسفۂ تعلیم اور نظام کار کو بھی سامنے رکھا ہے۔ دونوں کا ایک دوسرے سے مقابلہ کیا ہے اور ان کے درمیان حد فاصل کھینچی ہے۔خرابیوں اور خوبیوں کا جائزہ لیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ زندگی کو کامیاب طریقے سے برتنے اور اس کی مزاحمتوں پر قابو پانے کے لئے کس قسم کی تعلیم اور نظام تعلیم کی ضرورت ہے۔(۳)

اقبال اور اکبر کے تصور تعلیم اور پس و پیش منظر میں کافی مماثلتیں پائی جاتی ہیں۔دونوں کا تعلق مذہبی گھرانوں سے تھا اور دونوں نے مکتبی تعلیم پائی تھی۔دونوں کچھ فرق کے ساتھ مشرقی اور مغربی علوم سے واقف تھے اور مشرقی اقدار کو ترجیح دیتے تھے لیکن مغرب کی علمی اور سائنسی ترقی سے استفادہ کے قائل تھے۔ پیشہ سے دونوں وکیل تھے۔ دونوں نے قوم کی اصلاح کے لئے شاعری کو ذریعہ اظہار بنایا اور مذہبی و اخلاقی اصلاح کو ترقی کے لئے ضروری سمجھا کیوں کہ دونوں اسلامی تشخص کے قائل تھے۔جیسا کہ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار لکھتے ہیں۔

"مغربی فلسفے کے نت نئے بدلتے ہوئے مادی افکار اور سطحی گمراہ کن خیالات کی پردہ داری، بنابریں یورپ کے تیز رندوں کی شکایت سے لے کر ملت کے احیائے نو کے تصور تک دونوں فنکاروں کے افکار میں بڑی مماثلت نظر آتی ہے۔''(۴)

اکبر نے جو باتیں ظریفانہ انداز میں پیش کیں وہی باتیں اقبال نے اپنے فلسفہ میں سنجیدگی کے ساتھ بیان کیں۔جیسا کہ ڈاکٹر آصف اعوان رقمطراز ہیں۔

> "اکبر الہ آبادی کی فراہم کردہ تنقید مغرب کی بنیادوں پر بعد میں حکیم الامت علامہ محمد اقبال نے اپنے مخصوص علمی و فلسفیانہ انداز میں ایک عالیشان عمارت کھڑی کردی اور قوم کو فرنگی تہذیب کی ظاہری چکاچوند کی حقیقت اور کھوکھلی بنیادوں سے آگاہ کیا۔(۵)

سرشت میں ہو لا الہ تو کیا خوف
تعلیم ہو گو فرنگیانہ(٦)

اقبال اور مغربی نظام تعلیم

اقبال مغربی نظام تعلیم کو درست نہیں مانتے تھے۔اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ نظام تعلیم لوگوں کو مذہب اور روحانیت

سے بیزاری اور محض ظاہری اور مادی فوائد کے حصول پر زور دیتا تھا۔ اقبال معاشرتی زندگی میں مذہب کی اہمیت کے قائل تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ تہذیبی اقدار وروایات کا بنیادی سرچشمہ مذہب ہے۔لیکن مغربی نظام تعلیم کا ہدف ہی یہ ہے کہ مذہب کو معاشرتی زندگی سے خارج کر کے مسلمانوں کو ان کے دین سے برگشتہ کر دیا جائے انہیں اس بات کا شکوہ ہے کہ جدید تعلیم نے مسلم نوجوانوں کا گلہ گھونٹ دیا ہے۔

گلا تو گھونٹ دیا اہل مدرسہ نے تیرا
کہاں سے آئے صدا لا الہ الااللہ(۷)

اقبال کے نزدیک تعلیم کا مقصد محض معلومات کی ترسیل نہیں بلکہ اسلامی نظریہ حیات اور کلچر کا فروغ بھی ہے۔ اقبال اس بات پر رنجیدگی کا اظہار کرتے ہیں کہ جدید تعلیم سے فارغ التحصیل نوجوان اسلام کے سپاہی بننے کے بجائے مغرب زدگی کا شکار نظر آتے ہیں۔

آہ مکتب کا جواں گرم خوں
ساحر افرنگ کا صید زبوں (۸)

اس سرور میں پوشیدہ موت بھی ہے تیری
تیرے بدن میں گر سوز لا الہ نہیں(۹)

علامہ اقبال کا جو فلسفہ خودی ہے وہ تعلیم میں بھی نظر آتا ہے۔ اقبال نے انسان کو خودی کے درس میں خودشناسی کا پیغام دیا ہے۔ اسلامی تعلیمات کا پہلا اور بنیادی اصول خودآگاہی حاصل کرنا ہے لیکن مغربی نظام تعلیم میں صرف مادی اور دنیوی پہلو کو مدنظر رکھا گیا جبکہ انسان کی روحانی و داخلی زندگی سنوارنے کی طرف کوئی توجہ نہ دی گئی، اس لئے اقبال ایسی تعلیم کے حق میں تھے جو خودی کی تربیت کرے، اسے استحکام بخشے، انسان کو کائنات میں اس کے اس بلند مرتبہ سے آگاہ کرے اور جو تعلیم ایسا نہ کر سکے وہ بیکار اور نقصاندہ ہے۔

تری زندگی اسی سے ، تری آبرو اسی سے
جو رہی خودی تو شاہی نہ رہی تو روسیاہی(۱۰)

تعلیم کے تیزاب میں ڈال اس خودی کو
ہو جائے ملائم تو جدھر چاہے ادھر پھیر(۱۱)

تعلیم نسواں

تعلیم نسواں کا مسئلہ ہر دور میں مفکرین کی فکر کا مرکز رہا ہے۔اقبال کی نظر میں تعلیم نسواں کی بہت اہمیت تھی اور وہ اسے ضروری سمجھتے تھے۔لیکن وہ ایسی تعلیم کے قائل تھے جو دین پر مبنی ہو۔وہ ایسی تعلیم کی وکالت نہیں کرتے تھے جو خواتین کو شرم وحیا سے دور کردے۔

تہذیب فرنگی ہے اگر مرگ امومت
ہے حضرت انسان کے لئے اس کا ثمر موت

جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن
کہتے ہیں اسی علم کو ارباب نظر موت(۱۲)

اسلام میں مردوں کی طرح عورتوں کو بھی تعلیم حاصل کرنے کا حق ہے۔کیونکہ ایک مرد کی تعلیم فرد واحد کی تعلیم ہوتی ہے جبکہ ایک عورت کی تعلیم پورے خاندان کو آراستہ کرتی ہے۔بقول اقبال

" مرد کی تعلیم صرف ایک فرد واحد کی تعلیم ہے۔مگر عورت کو تعلیم دینا حقیقت میں تمام خاندان کو تعلیم دینا ہے۔دنیا میں کوئی قوم ترقی نہیں کرسکتی اگر اس قوم کا آدھا حصہ

جاہل مطلق رہ جائے۔(۱۳)

اقبال کہتے ہیں کہ عورت اگر علم و ہنر کے میدان میں کوئی بڑا کارنامہ انجام نہ دے سکے تو اس کا مرتبہ کم نہیں ہوتا۔اس کے لئے کیا یہ شرف کم ہے کہ زندگی کے ہر میدان میں کارہائے نمایاں انجام دینے والے مشاہیر اسی کی گود میں پروان چڑھتے ہیں۔

وجود زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ
اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوز دروں
شرف میں بڑھ کے ثریا سے مشت خاک اس کی
کہ ہر شرف ہے اسی درج کا در مکنون
مکالمات فلاطوں نہ لکھ سکی لیکن
اسی کے شعلے سے ٹوٹا شرارا فلاطوں(۱۴)

اقبال مشرقی تہذیب وتمدن کے دلدادہ تھے۔وہ مذہب کے پیروکار تھے اسی لئے وہ مغربی نظام تعلیم کے برعکس عورتوں کے لئے خاص مذہبی تعلیم امورخانہ داری سے متعلق تعلیم کو بنیادی حیثیت دیتے تھے۔اقبال لکھتے ہیں:

" عورت کے دل و دماغ کو مذہبی تخیل کے ساتھ ایک خاص مناسبت ہے۔لہٰذا قومی ہستی کی مسلسل بقا کے لئے یہ بات نہایت ضروری ہے کہ ہم اپنی عورتوں کو ابتدا میں ٹھیٹھ مذہبی تعلیم دیں"(۱۵)

اکبرالہ بادی بھی یہی بات کہتے ہوئے نظر آئے ہیں:

مذہب کے جو اصول ہو اس کو بتائے جائیں
باقاعدہ طریق پرشش سکھائے جائیں
اوہام جو غلط ہوں وہ دل سے مٹائے جائیں
سکے خدا کے نام دل میں بٹھائے جائیں (۱۶)

اقبال،مغربی سائنس اور مادیت پرستی

مادیت پرستی سے مراد اجسام، دنیاوی عیش وعشرت سے محبت، ذہنی اور روحانی انحطاط ہے۔ عام طور پر ہم مادہ کو دنیا، مادیت کو دنیاداری اور مادہ پرست کو دنیادار کے نام سے منسوب کرتے ہیں۔ سائنسی ترقی نے مغرب کو مادی حیثیت سے غیر معمولی طاقت تو بخشی اور اسے ظاہری شان وشوکت سے بھی مالا مال کیا،مگر اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بے انتہا مادیت پرستی نے انسان کو ہوس کا غلام بنا کر رکھ دیا اور یوروپ کو اخلاقی انحطاط کا شکار ہونا پڑا۔

ڈاکٹر آصف اعوان لکھتے ہیں:

"اقبال کی نظر میں مغرب کا قصور یہ ہے کہ اس نے اپنی تمام تر توجہ کا مرکز سائنسی ترقی اور مادیت پرستی کو بنالیا ہے۔اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مغربی معاشرہ نے روحانی و اخلاقی قدروں کو نظرانداز کر دیا۔ دین و مذہب اس کی نگاہ میں اپنی حیثیت کھو بیٹھے۔''(۱۸)

پورب میں بہت روشنی علم و ہنر ہے
حق یہ ہے کہ بے چشمۂ حیواں ہے یہ ظلمات(۱۹)

ہے دل کے لئے موت مشینوں کی حکومت
احساس مروت کو کچل دیتے ہیں آلات

اقبال اور مغربی تہذیب

اقبال نے اپنے کلام میں جابجا مغربی تہذیب وتمدن کی خامیوں پر نکتہ چینی کی ہے اور مسلم معاشرے کو اس کے مضر اثرات سے بچنے کی تلقین بھی کی۔ اگر چہ بعض نقادوں کا ماننا ہے کہ اقبال نے مغربی تہذیب پر اعتراضات کر کے انصاف سے کام نہیں لیا لیکن ایسا نہیں ہے بلکہ اقبال نے بہت سی جگہوں پر مغرب کے علم وفن اور سائنس وٹکنالوجی کا اعتراف بھی کیا ہے۔

مشرق سے ہو بیزار نہ مغرب سے حذر کر
فطرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب کو سحر کر

اقبال کوتہذیب مغرب کے صرف ان پہلوؤں سے شکایت ہے جنہیں وہ مسلم معاشرے کے لئے غیر ضروری سمجھتے تھے۔

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خود کشی کرے گی
جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا نا پائیدار ہوگا (۲۰)

اقبال اور مذہبی علوم

علامہ اقبال مذہبی علوم، جغرافیہ اور تاریخ کوشامل نصاب کرنے کی حمایت کرتے تھے۔ تاریخ کی اہمیت یہ ہے کہ اس سے ماضی کے احوال ملتے ہیں۔ ماضی کی مدد سے حال و مستقبل کوسنوارنے کا لائحہ عمل تیار کیا جاسکتا ہے۔ اقبال مذہب کو مرکزی حیثیت دیتے تھے۔ ان کا ماننا تھا کہ مذہب کے بغیر زندگی کا کوئی شعبہ بھی صحیح نتائج کے استخراج میں معاون نہیں ہوسکتا۔

علامہ اقبال کی ادبی اور تصنیفی خدمات

قدرت نے اقبال کوکئی صلاحیتوں کا منبع بنایا تھا۔ وہ بیک وقت شاعر، فلسفی اور مفکر تھے۔ جب انہوں نے زمانہ طالب علمی میں یہ غزل پڑھی:

موتی سمجھ کر شان کریمی نے چن لئے
قطرے جو تھے مرے عرق انفعال کے

اس وقت مرزاارشد گورگانی نے سن کر یہ پیش گوئی کی تھی کہ یہ لڑکا مستقبل کے عظیم شعرا میں سے ہوگا۔ اسی زمانہ میں انہوں نے نظم کی طرف بھی توجہ دی۔ ایک ادبی مجلس میں نظم ''ہمالہ'' سنائی تو اسے بہت پسند کیا گیا اور ان کی شہرت میں دن بہ دن ترقی ہونے لگی۔

اقبال کی تصانیف کی شروعات '' اسرار خودی'' سے ہوتی ہے۔ اسرار خودی اقبال کا پہلا شعری مجموعہ ہے جو فارسی زبان میں لکھا گیا۔ یہ پہلی بار 12 ستمبر 1915 کو منظر عام پر آیا۔ اب تک اس کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں

اور ترجمہ بھی کئی زبانوں میں ہوا ہے۔اسرار خودی اقبال کے فلسفیانہ خیالات کی حامل فارسی مثنوی ہے۔اس مثنوی میں علامہ نے ایک مکمل ضابطہ حیات پیش کیا ہے جس کا محور اور مرکز خودی ہے۔

''رموز بے خودی'' ان کی دوسری تصنیف ہے جو فارسی میں پہلی بار 1918 میں شائع ہوئی۔دراصل یہ اسرار خودی کے تسلسل کی دوسری کتاب ہے۔اس لئے کہ خودی کے بعد بے خودی کا شائع ہونا ضروری تھا کیوں کہ دونوں حصوں کو ملا کر اس فلسفہ کی تکمیل ہوتی ہے۔

''پیام مشرق'' فارسی شاعری کا تیسرا مجموعہ ہے۔ یہ 1923 میں منظر عام آیا۔اس میں لگ بھگ چار سال کے کلام شامل ہیں۔ پہلے دو کتابوں سے زیادہ اس کتاب کو شہرت ملی۔1924 میں منصۂ شہود پر ایک اور کتاب آتی ہے جس کا نام'' بانگ درا'' ہے۔اقبال کا یہ اردو کا پہلا شعری مجموعہ ہے جسے خوبصورت گلدستہ کہا جا سکتا ہے۔اس مجموعہ میں جہاں ایک طرف حب الوطنی سے لبریز ترانے ہیں بچوں کی نفسیات کے اعتبار سے دعائیں اور دیگر نظمیں بھی شامل ہیں شکوہ، جواب شکوہ اور نیا شوالہ جیسی لازوال نظم اسی مجموعہ میں شامل ہیں۔ 1927 میں دو اور کتابیں منظر عام پر آئیں جن کا نام'' زبور عجم'' اور'' گلشن راز جدید" ہے۔گلشن راز میں بہت مختصر کلام ہے مگر بہت ہی گہرے اور دقیق مسائل کو منظوم کیا گیا ہے۔تقریباً پانچ سال بعد انہوں نے ایک اور کتاب تصنیف کی جو جاوید نامہ کے نام سے شائع ہوئی۔ یہ بھی فارسی شاعری کا ایک مجموعہ ہے۔اس کا شمار علامہ کے بہترین کتابوں میں ہوتا ہے۔اور اسے وہ اپنی زندگی کا حاصل سمجھتے تھے- 1935، 1936 اور 1937 میں اردو میں اقبال کے یکے بعد دیگرے تین شعری مجموعے بال جبرئیل، ضرب کلیم اور ارمغان حجاز شائع ہوئے۔ارمغان حجاز علامہ کا آخری مجموعہ کلام ہے۔

اقبال ایک عہد شناس اور عہد ساز شاعر تھے۔ وہ بیک وقت شاعر، فلسفی، مصلح قوم، سیاست داں اور عالم تھے۔ انہوں نے اپنی فکر کے اظہار کے لئے اردو کی شعری لسانیات میں زبردست اضافہ کیا۔انہوں نے نثر میں بھی طبع آزمائی کی اور'' علم الاقتصاد'' ان کی پہلی نثری کتاب ہے جو 1904 میں شائع ہوئی۔ یہ کتاب معاشیات پر مشتمل ہے۔اقبال شروع سے ہی فکر و عمل کے پیکر تھے۔انہوں نے بڑی محنت سے یہ کتاب لکھی تھی اور خود ہی شائع کی تھی۔ The Development of Metaphysics in persia یہ علامہ کی دوسری تصنیف ہے جو پہلی بار 1908 میں لندن سے شائع ہوئی۔ دراصل یہ اقبال کا تحقیقی مقالہ ہے جس پر مویونخ یونیورسٹی جرمنی سے انہیں پی ایچ ڈی کی سند ملی تھی۔انگریزی زبان میں شائع ہونے والی ان کی دوسری کتاب Reconstruction of religious

thoughts in islam ہے، یہ مدراس، میسور، حیدرآباد اور علی گڑھ میں دئے گئے خطبات کا مجموعہ ہے جو پہلی بار 1931 میں شائع ہوا تھا۔

اقبال ایک عظیم شاعر تھے۔انہوں نے اپنی بات کو دوسروں تک پہنچانے کے لئے نظم ونثر دونوں کا سہارا لیا، خطوط لکھے، خطبے دئے اور مقالے بھی پڑھے۔ان کی نثری تحریریں آج بھی موجود ہیں۔ کچھ نثری پاروں کو انہوں نے اپنی زندگی ہی میں خود مرتب کرلیا تھا۔ بعد میں ان کی وفات کے بعد دیگر نثری تحریروں کو کئی لوگوں نے مرتب کیا اور الگ الگ نام سے شائع کیا۔ان میں خطوط کی تعداد زیادہ ہے۔اقبال نے شعری کلام کی ترتیب کے وقت کلام کا ایک حصہ حذف کر دیا تھا جسے بعد میں بعض احباب نے جمع کر کے شائع کیا۔ان کے خطوط کو بھی الگ الگ ناموں سے شائع کیا گیا۔بعض انگریزی تصانیف کے اردو تراجم ہوئے اس طرح ان کی تصانیف میں اضافہ ہوتا رہا۔

حوالہ جات

۱-محمد اقبال،ضرب کلیم مشمولہ کلیات اقبال (اردو) شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور 1973 شیخ 608 / 146

۲۔ایضاً ص 413 / 121

۳۔فرمان فتح پوری، اقبال سب کے لئے، باب الاسلام پرنٹنگ پریس، کراچی، 1978 ص 102

۴- ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، مطالعہ اکبر، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، 1984 ص 143

۵۔ڈاکٹر آصف اعوان، مغربی تہذیب کے مشرقی نقاد اکبر الہ آبادی اور اقبال، علی پرنٹرز لاہور، ص 83

۶۔محمد اقبال، کلیات اقبال (اردو) ص 549

۷۔محمد اقبال، ضرب کلیم

۸۔محمد اقبال، بال جبریل مشمولہ کلیات اقبال (اردو) ص 136\428

۹-محمد اقبال، ضرب کلیم مشمولہ کلیات اقبال (اردو) ص: 640 / 178

۱۰۔محمد اقبال، بال جبرئیل، مشمولہ کلیات اقبال (اردو) ص: 339 / 47

۱۱۔محمد اقبال، ضرب کلیم، مشمولہ کلیات اقبال (اردو) ص 616\154

۱۲۔ایضاً ص 558\96

۱۳-سید عبدالواحد معینی محمد عبداللہ قریشی (مرتبان)، مقالات اقبال، طفیل آرٹ پرنٹرز، لاہور 1982 ص 93

۱۴۔محمد اقبال، ضرب کلیم مشمولہ کلیات اقبال، ص 94\556

۱۵۔محمد اقبال، مقالات اقبال، ص 179-178

۱۶۔اکبر الہ آبادی، کلیات اکبر (حصہ اول) پنجاب پبلشرز، کراچی، ص 120

۱۷۔القرآن، سورہ المنفقون، آیت نمبر ۹

۱۸۔ڈاکٹر آصف اعوان، مغربی تہذیب کے مشرقی نقاد، ص: 212

۱۹۔محمد اقبال، بال جبرائیل، ص 7-108\400

۲۰۔محمد اقبال، ضرب کلیم، نظم: شعاع امید-

سیداکبرحسین اکبرالٰہ آبادی

حالات زندگی

سیداکبرحسین کی پیدائش 1846 میں الٰہ آباد کے پاس جمنا پار کے بارہ نامی گاؤں میں ہوئی۔ابتدائی تعلیم انہوں نے اپنے والدسید تفضّل حسین سے حاصل کی۔ان لوگوں کا خاندان بارہ کے علاقے میں مدت سے آباد تھا۔ قدامت پسند،متوسط الحال اورعزت نفس کے پاسدار اس خاندان نے قدیم کلاسیکی تعلیم کی روایتوں کو برقرار رکھا تھا۔ لیکن ان کی مالی حالت اچھی نہ تھی۔اکبر کو مجبوراً 1863 میں جمنا پار زیرتعلیم پل کے ٹھیکے دار کے یہاں کلرک کی ملازمت کرنا پڑی۔اس درمیان انہوں نے اپنی کوششوں سے انگریزی کی اچھی استعداد بہم پہنچائی اور 1867 میں عدالت ضلع کے وکلا کا امتحان باآسانی پاس کرلیا۔انہیں 1869 میں نائب تحصیل دار مقرر کیا گیا لیکن جلد ہی انہوں نے وہ نوکری ترک کردی اور ہائی کورٹ وکالتی امتحان پاس کرکے الہ باد ہائی کورٹ میں وکالت کرنے لگے۔

اکبر چند برس کی وکالت کے بعد 1880 میں وہ منصف کے عہدے پر فائز کئے گئے۔اس کے بعد وہ سرکاری ملازمت اورعہدوں میں مسلسل ترقی کرتے ہوئے 1894 میں سشن جج بنے۔جلد ہی وہ بنارس میں اور پھر دوسرے اضلاع میں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے عہدے پر فائز ہوئے۔حکومت انگلشیہ نے انہیں 1899 میں خطاب خان بہادر سے سرفراز کیا۔ملازمت سے سبک دوشی 1903 کے بعد وہ کوتوالی الہ اباد کے پیچھے اپنی تعمیر کردہ وسیع کوٹھی ''عشرت منزل'' میں آرام اورنیم خانہ نشینی کی زندگی گزارتے رہے۔اگرچہ اس زمانے میں انہیں آنکھوں کے تکلیف کے علاوہ اورکئی عارضے لاحق ہوئے لیکن بحثیت مجموعی ان کے دن اچھے گذرے۔اکبر نے 1921 میں اس دنیا سے کوچ کیا۔(۱)

سیداکبرحسین ایک ممتاز خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ان کا سلسلہ نسب حضرت امام رضا علیہ السلام سے ملتا ہے اوراس نسبت سے یہ اپنے کو رضوی لکھتے تھے۔ان کے مورث اعلیٰ سیدعلی عرب نیشاپوری (ایران) سے۶۳۲ء میں ہندوستان آئے تھے۔ان کے پردادا سید زماں بنگال کی فوج میں صوبہ دار تھے۔اورانگریزوں کی طرف سے پلاسی کی جنگ میں شریک ہوئے تھے۔(۲)

اکبر کی دو شادیاں ہوئی تھیں۔پہلی شادی خدیجہ نام کی لڑکی سے ہوئی لیکن ان دونوں میں ازدواجی زندگی نبھ

نہیں پائی۔دوسری بیوی کا نام فاطمہ صغریٰ تھا جن کو بعد میں اکبر بیگم کا لقب ملا۔ان سے دو بیٹے ہوئے دونوں بیٹوں سے اکبر کو کافی محبت تھی۔اکبر سادہ زندگی گزارتے تھے اور لوگوں کے ساتھ محبت،عزت،خوش اخلاقی اور خنداں پیشانی سے ملتے تھے۔وہ ہر فرقے،مذہب اور قوم کے لوگوں سے بڑے تپاک سے ملتے تھے۔

اکبر اور تہذیب نو

1857 کے بعد سر سید نے جس طرح ہندوستانیوں خصوصاً مسلمانوں کو مغربی علوم اور تہذیب سے قریب کرنے کی کوشش کی اور جس طرح روشن خیال مسلمانوں میں انگریز سے مرعوبیت کا احساس پیدا ہوا یہاں تک کہ وہ انگریز کی تقلید کو اپنے لئے باعث فخر سمجھنے لگے تو ان کی مخالفتیں ہونا شروع ہو گئیں۔مخالفت کرنے والوں اور سر سید کے عقائد و نظریات سے اتفاق نہ رکھنے والوں میں اکبر پیش پیش تھے۔دراصل اکبر مشرقی تہذیب کے علمبر دار تھے۔انہوں نے اپنی تمام زندگی اور اپنی ساری علمی صلاحیت مشرقیت کی حمایت میں صرف کر دی۔اکبر نے اس وقت مشرقیت کی پاسداری کا علم لہرایا جب جدید علوم کے اثرات مشرقی تہذیب و روایت سے دوری اور دین و مذہب سے بیگانگی کی صورت میں ظاہر ہونا شروع ہوئے۔اکبر الہ آبادی نے قوم کی رہنمائی کا فریضہ اپنے ذمہ لیا اور اس جانب قوم کو متوجہ کیا کہ

دین و ملت کی ترقی کا خیال اچھا ہے
اصل مضبوط ہو جس کی وہ نہال اچھا ہے

اکبر کو اس بات کا رنج تھا کہ مغربی تہذیبی یلغار نے مشرقی معاشرت کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔وہ چاہتے تھے کہ مشرقی معاشرہ اور اقدار و روایات کا تحفظ کیا جائے اور اس مقصد کے لئے بڑھتے ہوئے مغربی تہذیبی ریلے کے سامنے بند باندھا جائے۔انہوں نے مغرب پر تنقید محض تعصب کے جذبے کے تحت یا تنگ نظری کی بنا پر نہیں کی بلکہ مشرقی روایات اور اقدار سے گہری وابستگی اور دین و ایمان سے دلی لگاؤ ان کی تنقید کا باعث بنے۔اکبر نئی تہذیب کو کیسے دیکھتے ہیں ذیل کے اشعار ملاحظہ کیجئے:

داغ اب ان کی نظر میں شرافت کے نشاں

نئ تہذیب کی موجوں سے دھلے جاتے ہیں

نئ تہذیب سے ساقی نے ایسی گرم جوشی کی
کہ آخر مسلموں میں روح پھونکی بادہ نوشی کی

نئ تہذیب میں بھی مذہبی تعلیم شامل ہے
مگر یونہی کہ گویا آب زمزم مے میں داخل ہے

تہذیب نو کے رنگ پر بلبل بنے ہیں‌سب
واللہ کیا بہار ہے اس سبز باغ میں

یہ موجودہ طریقے راہی ملک عدم ہو نگے
نئ تہذیب ہوگی اور نئے سامان بہم ہوں گے

نہ خانوں میں رہ جائے گی پردے کی پابندی
نہ گھونگھٹ اس طرح سے حاجب روے صنم ہوں جو گے

عقائد پر قیامت آئے گی ترمیم ملت پر
نیا کعبہ بنے گا مغربی پتلے صنم ہوں گے

اکبر کا نظریہ تعلیم:

تعلیم نسواں:

کئی مفکرین کی طرح اکبر نے بھی تعلیم نسواں پر اظہار خیال کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ:

لڑکی جو بے پڑھی ہو تو وہ بے شعور ہے۔

لیکن وہ ایسی تعلیم کی حمایت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں جو اپنی تہذیب و اخلاق اور دین و مذہب کو نہ بھلائے۔ چنانچہ ڈاکٹر صغرا مہدی اپنی کتاب "اکبر کی شاعری کا تنقیدی مطالعہ" میں بیگم خواجہ حسن نظامی سے لئے گئے ایک انٹرویو کا ذکر کرتے ہوئے انھی کی زبانی لکھتی ہیں۔ یہ بات اکبر الہ آبادی سے بیگم خواجہ حسن نے پوچھی تھی:

> ''میں عورتوں کی تعلیم کا مخالف نہیں۔ انہیں تعلیم ملنی چاہئے۔ انہیں مذہب سے واقفیت ہونا بھی ضروری ہے۔ حفظان صحت کے اصولوں سے بھی انہیں واقف ہونا چاہیے۔ حساب کتاب بھی آنا چاہیے۔ اور اخلاقی اور سبق آموز کتابیں ان کے مطالعے میں رہنی چاہیے تا کہ وہ اپنے بچوں کی اچھی تربیت کر سکیں۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ عورتوں کی تعلیم کے مخالف نہیں تھے۔ مگر اس حق میں تھے کہ عورتوں کو وہ تعلیم حاصل کرنا چاہئیے جو امور خانہ داری، بچوں کی تربیت میں معاون ثابت ہوں۔'' (۳)

اکبر تعلیم نسواں کی اس حد تک وکالت کرتے ہیں کہ:

تعلیم لڑکیوں کی ضروری تو ہے مگر
خاتون خانہ ہوں، وہ سبھا کی پری نہ ہوں

دوا سے شو ہر واطفال کی خاطر تعلیم
قوم کے واسطے تعلیم نہ دو عورت کو

اکبر ایسی تعلیم کی بات کرتے ہیں جو اسلامی اور مشرقی ہو۔جس میں اخلاق کا پاس ولحاظ رکھا گیا ہو۔ وہ عورتوں کے زن کے بجائے نازن" ہونے سے ڈرتے ہیں اور " چراغ خانہ " کے بجائے ''شمع محفل'' ہونے سے گھبراتے ہیں۔ وہ ایسی تعلیم وتربیت کی بات کرتے ہیں جو تہذیب اور شرافت سکھائے۔ وہ عورتوں کو حساب و کتاب سیکھنے اور امور خانہ داری سے واقفیت کی بات کرتے ہیں۔

تعلیم عورتوں کو بھی دینی ضرور ہے
لڑکی جو بے پڑھی ہو تو وہ بے شعو رہے

لیکن ضرور ہے کہ مناسب ہو تربیت
جس سے برادری میں بڑھے قدرو منزلت

ہر چند ہو علوم ضروری کی عالمہ
شوہر کی ہو مرید تو بچوں کی خادمہ

مذہب کے جو اصول ہوں اس کو بتا ئے جائیں
باقاعدہ طریق پرستش سکھا ئے جائیں
ادہام جو غلط ہوں وہ دل سے مٹائے جائیں
سکے خدا کے نام کے دل میں بٹھائے جائیں

گھر کا حساب ماں سیکھ لے خود آپ جوڑنا
اچھا نہیں ہے غیر پہ یہ کام چھوڑنا

کھانا پکانا جب نہیں آیا تو کیا مزا
جو ہر ہے عورتوں کے لئے پہ بہت بڑا

سینا پرونا عورتوں کا خاص ہے ہنر
درزی کی چوریوں سے حفاظت پہ ہو نظر

تعلیم کی طرف ابھی اور اک قدم بڑھیں
صحت کے حفظ کے جو قواعد ہیں وہ پڑھیں

پبلک میں کیا ضرور کہ جا کر تنی رہو
تقلید مغرب پہ عبث کیوں ٹھنی رہو

جاتی ہے اسکول میں لڑکی تو کچھ حاصل کرے
کیا ہوا حاصل جو بس بے باک بن کے رہ گئی

اکبراور مغربی تعلیم

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ جب بھی کسی قوم نے دوسری قوم پر فتح ونصرت کے جھنڈے لہرائے تو نہ صرف سیاسی غلبہ حاصل کیا بلکہ سماجی لحاظ سے بھی مفتوح قوم کو نیچا دکھانے کی ہر ممکن کوشش کی۔ انگریزوں نے جب ہندوستان پر قابض ہونے کے بعد اپنا نظام تعلیم متعارف کرایا تو اس کا واحد مقصد یہ تھا کہ مقامی رعایا اپنی تہذیب وثقافت سے منہ موڑ کر صرف اور صرف نئے حاکموں اور ان کی درآمد شدہ تہذیبی قدروں کے گن گائے۔ گویا ہندوستانی اگرچہ وہ رنگ ونسل کے لحاظ سے ہندوستانی رہیں تاہم ذہن اور مزاج کے اعتبار سے انگریز بن جائیں۔(۴)

ہندوستان میں یوروپی تمدن کی کورانہ تقلید تعلیم کی خرابی کے باعث ہوئی۔ انگریزوں نے جو طریقہ تعلیم اس ملک میں رائج کیا اس کا مقصد صرف دنیا طلبی ہے۔ اس تعلیم نے ہندوستانی نوجوانوں کو علم واخلاق وشائستگی سکھلانے کے بدلے انہیں تہذیب حاضر کا غلام بنا دیا۔ چنانچہ اکبر نے مغربی طرز تعلیم اور اس کے ضرر رساں اثرات پر دل کھول

کر زبردست اعتراضات کئے ہیں اوران کے مختلف پہلوؤں پر نئے نئے عنوان سے بڑے تیز نشتر چبھوئے ہیں۔(۵)

پڑھ کے انگریزی میں دانا ہو گیا
کم کا مطلب ہی کمانا ہو گیا

تعلیم دی جاتی ہے ہمیں وہ کیا ہے فقط بازاری ہے
جو عقل سکھائی جاتی ہے وہ کیا ہے فقط سرکاری ہے

نئی تعلیم کو کیا واسطہ ہے آدمیت سے
جناب ڈارون کو حضرت آدم سے کیا مطلب

رنگ چہرے کا تو کالج نے بھی رکھا قائم
رنگ باطن میں مگر باپ سے بیٹا نہ ملا

تعلیم جدید سے ہوا کیا حاصل
ہاں کفر کے ساتھ جنگ جوئی نہ رہی

نئی تعلیم میں تقوے کا وہ اکرام کہاں
ناز بے حد ہیں مگر غیرت اسلام کہاں

باپ ماں سے، شیخ سے، اللہ سے کیا ان کو کام
ڈاکٹر جنوا گئے تعلیم دی سر کا ر نے

طفل سے بو آئے کیا ماں باپ کے اطوار کی
دودھ تو ڈبے کا ہے تعلیم ہے سرکار کی

اکبر اس بات سے مایوس تھے کہ مغربی تعلیم ہمارے نوجوانوں کو اپنی تہذیب، تاریخ، مذہب، قوم اور ذہنی سرمائے سے غافل کر رہی ہے۔ ہم یورپ کی ہر بات کو صحیح اور ایشیا کی ہر بات کو غلط سمجھتے ہیں۔ اپنے شاعروں اور فلسفوں سے ناواقف ہوئے جاتے ہیں اور موقع بہ موقع یوروپ کے لکھنے والوں کے حوالے دیتے ہیں:

غزالی و رومی کو بھلا کون سنے گا
محفل میں چھڑا نغمہ اسپنسر ول ہے

فخریہ میں نے جو اشعار پڑھے سعدی کے
فخریہ آپ سنانے نے لگے نظم ملٹن

شیخ سعدی تو بزرگوں میں تھے میرے دوست
آپ کے کون تھے ملٹن یہ سنوں قبلۂ من

انگریزوں نے ہندوستان میں جو نظام تعلیم رائج کیا اس کا مقصد دین سے بے بہرہ، شرم و حیا کے عدو اور عشوۂ مغرب کی پرستار خواتین پیدا کرنا تھا۔ تاکہ نئی نسل اپنے ہاتھوں میں پرورش پائے کہ آگے چل کر وہ مغربی ہاتھوں کی بے دام غلام اور وفادار ثابت ہو سکے۔(۶) اکبر کہتے ہیں:

حامدہ چمکی نہ تھی انگلش سے جب بیگا نہ تھی
اب ہے شمع انجمن پہلے چراغ خا نہ تھی

تعلیم کی خرابی سے ہوگی بالآخر
شوہر پرست بی بی ، پبلک پسند لیڈی

اکبراور مذہب:

اکبر کے نزدیک مذہب کی حیثیت ویسے ہی ہے جیسے کسی بھی درخت کا تعلق اپنے جڑ سے ہوتا ہے۔اکبر کے تہذیبی نظریئے کی بنیاد مذہب پر ہے۔وہ سیاسی،عمرانی اور معاشرتی زندگی کا سرچشمہ مذہب ہی میں تلاش کرتے ہیں۔ ڈاکٹر محمد ذکریا لکھتے ہیں

''اکبر کے نزدیک مذہب انسانوں کے لیے مرکز کی حیثیت رکھتا ہے۔اگر مذہب نہ ہو انسان جلد ہی منتشر ہو جاتا ہے . اجتماعی مفاد کا احساس جاتا رہتا ہے اور انفرادی نفع اندوزی کا جذبہ غالب آجاتا ہے۔''

مذہب سے ہی حفاظت قومی ہے اے عزیز
نادان ہے کو اڑ ہٹائے جو چول سے(۷)

دوسری جگہ کہتے ہیں:

مذہب کا معاشرت سے ہے ربط کمال
دونوں جو ہوں مختلف تو آرام محال
پہلے یہ مسئلہ سمجھ لیں احباب
بعد اس کے رفارم کا کریں دل میں خیال

اکبر تہذیب جدید کی برائیوں کی اصلاح کے لئے مذہب دوستی کی یقین کرتے ہیں۔وہ مذہب اور اصول مذہب کو انسانیت کے درد کا درماں بتاتے ہیں اور اسی لئے زندگی کی بنیاد انہیں اصولوں پر لکھنا چاہتے ہیں جو مذہب کے بنیادی عناصر ہیں۔

تعلیم مذہبی کا خلاصہ یہی تو ہے
سب مل گئے اسے جیسے اللہ مل گیا

ہم نشیں کہتا ہے کچھ پروا نہیں مذہب گیا
میں یہ کہتا ہوں کہ بھائی یہ گیا تو سب گیا(۸)

اکبر کی ادبی خدمات:

اکبر ایک ذہین وفطین انسان اور مشرقی تہذیب کے پاسباں تھے۔ وہ سیاسی، مذہبی، معاشرتی جیسا کوئی بھی معاملہ ہو اس کی تہ تک فوراً پہنچ جاتے اور اسے اپنے شوخ تقریر وتحریر کے ذریعے اس انداز میں بیان کرتے کہ ایک دلچسپ لطیفہ بن جاتا۔ وہ اپنی ظریفانہ شاعری کے لئے جانے جاتے ہیں ان کے یہاں ظریفانہ شاعری کے سب نمونے پائے جاتے ہیں۔انہوں نے اپنے مخصوص انداز بیان سے ہوا کا رخ موڑنے کی کوشش کی اور آخری دم تک اس کا برملا اظہار کرتے رہے۔ اکبر اردو کے ان مایہ ناز شاعروں میں سے ہیں جن کا کلام ایک طرف تو اپنے زمانے کی سیاسی اور سماجی کشمکش کا مرقع ہے تو دوسری طرف ان کے مخصوص مزاحیہ اسلوب کی وجہ سے ان کا کلام ہمارے ادب کا بہترین سرمایہ بن گیا ہے۔

اکبر کو بچپن ہی سے مطالعے کا بے حد شوق تھا۔انہوں نے خود ہی انگریزی زبان میں مہارت حاصل کی اور شعرا کے کلام سے استفادہ کیا۔حافظہ کا یہ عالم تھا کہ مجلس شعر میں حسب ضرورت مستند اساتذہ فن کے اردو اور فارسی کلام سے بے شمار سندیں پیش کر دیتے تھے۔(۹)

اکبر الہ آبادی نے 16۔15 سال کی عمر سے ہی شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔وحید الدین وحید ان کی شاعری کے استاد تھے۔ان کے شروعاتی دنوں کے کلام زیادہ تر اودھ پنچ میں شائع ہوتے تھے جو منشی سجاد حسین نے جاری کیا تھا۔اس میں عموماً مزاح نگاروں کے مضامین شائع ہوا کرتے تھے۔"اکبر،جن کی طبیعت میں ظرافت کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا تھا اودھ پنچ کی طرف فطرتاً کھنچ گئے۔ان کے مزاحیہ مضامین ۱۸۷۴ سے ۱۸۸۰ تک اس میں شائع ہوتے رہے"(۱۰)

اکبر نے اردو کے اکثر بڑے اور نامور شعرا کی طرح اپنی شاعری کی ابتدا غزل سے کی تھی۔ان کے زمانہ نومشقی کے چند اشعار ملاحظہ ہوں

چشم عاشق سے گریں لخت دل بیتاب و اشک
آپ یوں دیکھیں تماشہ جان کر سیماب و اشک
اپنے دامن پر گرا کیوں اسے کرتے خراب
جانتے یکساں اگر نہ ہم گوہر نایاب و اشک

اکبر نے شاعری کی شروعات غزل سے کی تھی لیکن انہیں زیادہ اس صنف میں کامیابی اور شہرت نہ ملی بلکہ نظم نگاری اور دوسری صنفوں سے ملی۔اکبر کو تضمین میں مہارت حاصل تھی۔وہ کسی شعر کی تضمین اس انداز سے کرتے کہ گویا وہ کوئی علیحدہ مصرع یا فقرہ نہیں ہے۔ناسخ کے ایک مشہور مطلع پر اکبر کچھ یوں تضمین کرتے ہیں:

میرا کینہ نتیجہ ہے جفائے چرخ گرداں کا
میرا پینا ہے منبع سل اشک چشم گریاں کا
مرا جینا ہے بس اک سلسلہ انفاس سوزاں کا
مرا سینہ ہے مشرق آفتاب داغ ہجراں کا
طلوع صبح محشر چاک ہے میرے گریباں کا

اکبر کو انگریزی زبان پر بھی گہری گرفت تھی۔وہ اپنے شعروں میں انگریزی کے الفاظ کچھ اس طرح پروتے ہیں جیسے یہ اردو کے اپنے الفاظ ہوں۔وہ انگریزی کے بہت ثقیل الفاظ کو سلیس زبان دے کر پیکر جمال میں ڈھال دیتے ہیں۔ذیل کے چند شعر دیکھئے۔

پانی پینا پڑا ہے پائپ کا
حرف پڑھنا پڑا ہے ٹائپ کا

مل کا آٹا ہے نل کا پانی ہے
آب و دانہ کی حکمرانی ہے

اکبر کے کلام کا کمال ہے کہ خواہ وہ کسی دور کا ہو شروع سے آخر تک ان کے اعلیٰ نصب العین یعنی وسیع معنوں میں اصلاح، اخلاق، ظرافت اور نادر طرز ادا کا حامل ہے۔ (۱۱)

حوالہ جات

۱۔شمس الرحمان فاروقی، اکبرالہ آبادی، نئی تہذیبی سیاست اور بدلتے ہوئے اقدار،۱۴واں ذاکر حسین یادگاری خطبہ 2002،ص1,2

۲۔سید حسین (مرتبہ) اشعار اکبر، کتاب منزل سبزی باغ، پٹنہ، دوسرا ایڈیشن،ص74,75,2

۳۔صغرا مہدی، اکبر کی شاعری کا تنقیدی مطالعہ, مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ, دہلی,1981،ص73-74

۴۔ڈاکٹر آصف اعوان، مشرقی تہذیب کے مشرقی نقاد، علی پرنٹرز لاہور،ص118

۵۔سید حسن (مرتبہ) اشعار اکبر،ص79

۶۔ڈاکٹر آصف اعوان، مشرقی تہذیب کے مشرقی نقاد، علی پرنٹرز لاہور، 136

۷۔ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، اکبرالہ آبادی: تحقیقی وتنقیدی مطالعہ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، 2003،ص173

۸-سید حسن (مرتبہ) اشعار اکبر،ص65

۹۔عبدالجلیل۔اے (مرتبہ) روح اکبر، سنٹرل پبلیشنگ ہاؤس، بنگلور،ص14

۱۰۔ایضاً،ص:29۔30

۱۱۔ایضاً ص:36

ڈاکٹر ذاکرحسین

حالات زندگی

ہندوستان کی عظیم ہستیوں میں شامل ایک نام ذاکرحسین کا بھی ہے۔ذاکرحسین کی شخصیت کے کئی پہلونمایاں ہیں۔ وہ بیک وقت ماہر معاشیات ،ماہر سیاسیات اور ماہر تعلیم تھے۔ وہ صبر اور شکر کا پیکر استقلال و اطمینان کے پرورده، پختہ یقین اور ہمت افزائی کے مرد آہن، خطابت و بیان کے تاجدار اور بلا کی ذہانت رکھنے والے ایک عظیم انسان تھے۔

ڈاکٹر ذاکرحسین ایک فریدی پٹھان خاندان میں 8 فروری 1897ء کوحیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ان کے والد فداحسین 20 برس کی عمر میں یوپی کے قائم گنج ضلع فرخ آباد سے حیدرآباد چلے گئے تھے ڈاکٹر ذاکرحسین کا بچپن حیدر آباد میں گزرا۔ ذاکرحسین کا خاندان اہل علم کا خاندان تھا۔اس خاندان سے کئی عظیم ہستیاں پیدا ہوئیں جیسے ان کے بڑے بھائی یوسف حسین خان مشہور مورخ، ادیب اور محقق تھے اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پرووائس چانسلر تھے۔ان کے چھوٹے بھائی محمود حسین خان پاکستان کے ماہر تعلیم ،مورخ ومبلغ اور جامعہ کراچی کے وائس چانسلر تھے اور ذاکرحسین کے بھانجے ماہرلسانیات اور جامعہ ملیہ کے وائس چانسلر تھے اور ان کے والد خود ایک کامیاب بیرسٹر تھے۔

ذاکرحسین کی ابتدائی تعلیم گھر سے ہی شروع ہوئی۔انہوں نے اٹاوہ کے اسلامیہ اسکول سے ہائی اسکول کیا۔ ایم اے او کالج علی گڑھ سے ایف اے کیا۔ پھر ان کی دلچسپی میڈیکل کی طرف مائل ہوئی اور انہوں نے لکھنو کے میڈیکل کالج میں داخلہ بھی لیا لیکن بیمار ہونے کی وجہ سے اسے جاری نہ رکھ سکے۔ واپس علی گڑھ آئے اور شعبہ آرٹس میں داخلہ لیا۔ بی اے آرٹس مضامین سے کیا۔اقتصادیات میں ایم اے کیا۔ پھر ایل ایل بی بھی کیا۔اعلیٰ تعلیم کے لئے جرمنی گئے جہاں سے انہوں نے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ دوران تعلیم آزادی کی تحریکوں میں بھی حصہ لیا اور تحریک خلافت اور ترک موالات کے سلسلے میں جیل بھی گئے۔

ڈاکٹر صاحب بانیان جامعہ ملیہ میں سے تھے۔گاندھی جی کے نظریہ واردھا تعلیم یا بنیادی تعلیم کے تصورات کو عملی جامہ پہنانے میں ان کا اہم رول تھا۔ ڈاکٹر ذاکرحسین آزادی کے بعد علی گڑھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر بنے۔ 1957 میں صوبہ بہار کے گورنر کے عہدے پر فائز ہوئے۔ بھارت کے نائب صدر 1962 میں بنے اور صدر بھارت

1967 میں مقرر کیے گئے۔صدر جمہوریہ کے عہدہ سنبھالنے کے بعد انہوں نے جو تقریر کی تھی اس کا خلاصہ کچھ یوں ہے:

''سارا ہندوستان میرا گھر ہے اور اس کے باشندے میرا کنبہ۔عوام نے کچھ عرصے کے لئے مجھے اس کنبے کا سربراہ مقرر کیا ہے۔میں سچی لگن سے اس گھر کو مستحکم اور خوبصورت بنانے کی کوشش کروں گا تا کہ یہ گھر ان عظیم لوگوں کے شایان شان بن سکے جو انصاف، خوشحالی اور شائستگی کی بنیادوں پر زندگی سنوارنے میں لگے ہیں۔"(1)

ذاکر حسین نے شیخ الجامعہ ملیہ سے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر کے منصب تک، بہار کے گورنر بننے سے بھارت کے وائس پریسڈنٹ اور پریسیڈنٹ کے عہدے پر فائز ہونے تک ہر جگہ اپنے کام کو بہ حسن وخوبی سرانجام دیا اور دیرپا اثراث مرتب کئے۔ بالآخر وہ آفتاب جو اپنی تابانیاں بکھیرتا تھا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے غروب ہو گیا ڈاکٹر صاحب نے 3 مئی 1969 دن گیارہ بج کر پانچ منٹ پہ آخری سانس لی۔ان کے انتقال کے بعد دو دنوں تک ان کے جسد خاکی کو آخری دیدار کی وجہ سے دفنایانہیں جاسکا۔دو دن بعد یعنی 5 مئی 1969 کو جامعہ میں دفن کئے گئے۔یہ وہی جامعہ ہے جسے انہوں نے کئی سالوں تک بے شمار مشکلوں اور مصیبتوں کا سامنا کر کے اوج ثریا تک پہنچا دیا۔

ڈاکٹر ذاکر حسن کے تعلیمی نظریات

ذاکر صاحب کے تعلیمی نظریات ہمیں ان کے مختلف یونیورسٹیوں میں دیے گئے خطبات اور 1937 میں دیے گئے رپورٹ سے واضح نظر آتے ہیں۔ذاکر صاحب نے اپنی زندگی میں کئی اہم تعلیمی خطبات دیئے جن میں کاشی ودیا پیٹھ، آل انڈیا ریڈیو، جادو پور یونیورسٹی، لکھنؤ یونیورسٹی، کلکتہ یونیورسٹی، پنجاب یونیورسٹی اور وشو بھارتی یونیورسٹی کے خطبات شامل ہیں۔انہوں نے تعلیم کی تعریف، تعلیم کے مقاصد اور تعلیم کے اقدار پر روشنی ڈالی ہے۔وہ تعلیم کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

" تعلیم دراصل کسی سماج کی اس جانی بوجھی، سوچی سمجھی کوشش کا نام ہے جو وہ اس لئے کرتی ہے کہ اس کا وجود باقی رہ سکے اور ان کے افراد میں یہ قابلیت پیدا ہو کہ بدلے ہوئے حالات کے ساتھ سماجی زندگی میں بھی مناسب اور ضروری تبدیلی کر سکیں۔'' (۲)

اور یہ بھی کہا کہ:

"جو سماج اپنی تعلیم کا نظام درست نہیں رکھتا وہ اپنے وجود کو خطرے میں ڈالتا ہے۔''. (۳)

دراصل ذاکر حسین فرد کی تعلیم کو تعلیم نہیں سمجھتے بلکہ ان کے نزدیک اصلی اور ابتدائی چیز معاشرہ ہے۔ معاشرہ ان کے تعلیمی فلسفے کا ایک اہم جز ہے۔ انسان کے افکار و نظریات کا ارتقا جو تعلیم کا اصل مقصد ہے، سماج کے بنا ممکن نہیں۔ وہ سماج کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''جس طرح کچھ عرصہ میں جسم کا ایک ایک ذرہ بدل جاتا ہے مگر جسم کی زندگی برابر جاری رہتی ہے۔ جس طرح درختوں کی پتیاں بدل جاتی ہیں مگر درخت وہی رہتا ہے۔ اسی طرح سماج کے افراد بھی برابر ختم ہوتے رہتے ہیں۔ - مگر سماجی زندگی باقی رہتی ہے۔ ہر زندہ چیز کی طرح سماج میں بھی دو کام برابر ہوتے رہتے ہیں۔ ایک تو بدلتے رہنے کا اور ایک اپنے حال پر قائم رہنے کا۔ ان میں سے کوئی ایک کام بھی رک جائے تو موت کا سامنا ہوتا ہے" (۴)

ڈاکٹر صاحب نے تعلیم کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے پہلا معلومات کا جمع کرنا۔ دوسرا معلومات میں آئے مواد کے لب لباب کو مرتب کرنا اور تیسرا اس کے مفید اجزا سے شخصیت کی تعمیر و ترقی کو یقینی بنانا۔ دراصل ان کے نزدیک تحصیل علم کا مقصد تلاش حق ہے، اور تلاش حق کا مدعا خدمت خلق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے نظریہ تعلیم میں خدا کے وجود، اس کی اطاعت اور اس کی مخلوق کی خدمت کی طرف رہنمائی بدرجہ اتم موجود ہے۔ ان کی زندگی میں اقدار

کی کافی اہمیت ہے۔ ان کے نزدیک خلوص، محبت، ہمدردی، حمیت، صبر، شکر راست بازی اور مساوات یہ سب ایسی قدریں ہیں جن سے روح کی پاکیزگی اور سچی مسرت حاصل ہوتی ہے۔ سماج میں صحیح ربط وضبط اور صالح نظام زندگی اجتمائی اقدار سے ہی ممکن ہے۔

ڈاکٹر ذاکر حسین کے نزدیک تعلیم کے مقاصد میں سیرت سازی، ذہنی تربیت، دستکاری، اخلاقی تربیت، تلاش حق، پیشہ وارانہ تعلیم اور سماجی تربیت واقدار شامل ہیں۔ وہ اخلاقی تربیت یا سیرت کی تعمیر کو کافی اہمیت دیتے تھے۔ زمانہ قدیم میں کردار سازی کو ہی تعلیم سمجھا جاتا تھا لیکن موجودہ تعلیمی نظام میں اسے کوئی مقام حاصل نہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ آج انسان ڈاکٹر، انجنیر، سائنس داں ہونے کے باوجود انسان نہیں بن پا رہا ہے۔ عبداللہ ولی بخش قادری لکھتے ہیں:

> ''ذاکر صاحب سیرت سازی اور اقدار کی پاسداری کو ہی تعلیم کا مقصد گردانتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ہم میں سے ہر ایک کے دل میں سیطنیت اور انسانیت موجود ہے۔ تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ شیطنیت کو ہمارے اندر دبا دیا جائے۔ تعلیم کا سارا راز ہی یہ ہے کہ حیوانیت کو اور انسانیت کی صفات کی پرورش ہو۔'' (۵)

اسی طرح وہ تلاش حق یا روحانی تربیت کو بھی مقصد تعلیم کا ایک اہم حصہ سمجھتے تھے۔ روحانی تربیت سے مراد یہ ہے کہ بندہ اپنے خالق کو پہچان کر جذبہ بندگی کے ساتھ زندگی گزارنے کے لائق ہو جائے۔ جذبات کی تربیت میں بھی اس کا بڑا رول ہے اور اخلاقی تربیت تو روحانی تربیت کے بغیر ممکن ہی نہیں۔ سماجی شعور کو یقینی بنانا بھی تعلیم کا ایک اہم مقصد ہے کیونکہ بچے کو اپنی زندگی ہر اعتبار سے سماج میں ہی گزارنی ہے۔ اس کے اندر سماجی احساس کا بیدار ہونا ضروری ہے۔ اس کے لئے مذہبی تعلیم کو وہ ضروری سمجھتے تھے۔ خواجہ غلام السیدن لکھتے ہیں:

> ان کی نظر میں مذہب اسی قدر اہم اور بنیادی چیز ہے کہ اس کے مقابلے میں زندگی کی تمام دوسری قدریں، دوسرے اغراض، دوسری مصلحتیں بے وزن ہیں۔ اگر وہ روح مذہب کی نفی کریں وہ مذہب کے معاملے میں کسی خود فریبی کو، کسی دکھاوے کے انتظام سے اطمینان حاصل کرنے کو نہ صرف دینی بد دیانتی سمجھتے ہیں

بلکہ گناہ اسی وجہ سے وہ چاہتے ہیں کہ مذہبی تعلیم اس انداز سے دی جائے کہ افراد کی زندگی کے ہر پہلو پر اثر انداز ہو۔(۶)

ذاکرحسن اعلیٰ اور ثانوی تعلیم سے بھی زیادہ ابتدائی تعلیم پر زور دیتے تھے۔ کیونکہ ابتدائی تعلیم ملک کے تعلیمی نظام کی بنیاد ہوتی ہے۔ اس کو درست کیئے بنا مڈل اور اعلیٰ تعلیم کے روشن مستقبل کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ ابتدائی تعلیم کو معیاری بنا کر ہی ملک اور عوام کو ترقی کی راہ پر گامزن کیا جا سکتا ہے۔ سب سے پہلے گاندھی جی نے ملک میں ابتدائی تعلیم کا تصور پیش کیا تھا۔ انہوں نے 1937 میں واردھا کی آل انڈیا تعلیمی کانفرنس میں نئی تعلیم کے نام سے ابتدائی تعلیم کا مکمل خاکہ سرکار کے سامنے رکھا تھا جسے بعد میں بنیادی تعلیم اور واردھا یوجنا کے نام سے جانا گیا۔ انہوں نے بچوں کو پورے ملک میں بنیادی تعلیم مفت اور لازمی طور پر دینے کی وکالت کی تھی۔ وہ معیاری تعلیم مادری زبان میں دیئے جانے کے حامی تھے۔ ان کا یہ بھی خیال تھا کو تعلیم روزگار دینے والی ہونے چاہیے۔ گاندھی جی نے جب اپنا بنیادی تعلیمی نظریہ پیش کیا تھا تو بہت سے ماہر تعلیم اور کئی سیاسی نیتاؤں نے اس سے اعتراض کیا لیکن ذاکرحسین نے گاندھی جی کی ''بنیادی تعلیم'' کی نہ صرف تائید کی بلکہ اسے عملی جامہ پہنانے کی پوری طرح کوشش بھی کی۔ پروفیسر محمد مجیب لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر ذاکرحسین خود بھی سمجھتے ہیں کہ سچی تعلیم وہ ہے جس میں انسان کی تمام صلاحتیں نشوونما پائیں اور چونکہ یہ ایک مانی ہوئی بات ہے کہ خالی کتابیں پڑھ لینے سے یہ مطلب حاصل نہیں ہوتا۔ اس لئے وہ بھی چاہتے ہیں کہ ابتدائی تعلیم میں خصوصاً ہاتھ کے کام کو زیادہ سے زیادہ اہمیت دی جائے۔''(۷)

ڈاکٹر صاحب بچوں کی اخلاقی تعلیم وتربیت کی زبردست حمایت کرتے تھے۔ انہوں نے کئی تقریریں صرف بچوں کی کردار سازی کے حوالے سے کی تھیں۔ انہوں نے اساتذہ کے اوصاف اور خصوصیات پر بھی توجہ دی تھی۔ ایک اچھے استاد کے اوصاف بتاتے ہوئے لکھتے ہیں:

"استاد کی کتاب زندگی کے سرورق پر علم نہیں لکھا ہوتا۔ محبت کا عنوان ہوتا ہے۔

اسے انسانوں سے محبت ہوتی ہے۔ سماج جن خوبیوں کا حامل ہے ان سے محبت ہوتی ہے۔ ان ننھی جانوں سے محبت ہوتی ہے جو آگے چل کر ان خوبیوں کی حامل بننے والی ہیں" (۸)

نیز یہ کہ:

"اچھے استاد کی سب سے پہلی اور سب سے بڑی پہچان یہی ہے کہ اس کی طبعیت کا میلان آپ ہی آپ بچوں اور نو جوانوں کی بنتی ہوئی شخصیتوں کی طرف ہوتا ہے۔ ان ہی میں رہ کر راحت ملتی ہے۔'' (۹)

ڈاکٹر ذاکر حسین خود ایک ماہر تعلیم، استاد اور معلم تھے اسی لئے ڈاکٹر ذاکر حسین کی تقاریر و خطبات اور ان کی تحریر و تصنیف میں جو بات سب سے زیادہ نمایاں ہے وہ انسانیت، انسان کی تربیت، اس کے اندر کے جوہر کی تلاش، انسانی اقدار، انسانی ہمدردی اور اس کی فلاح، شریف النفسی، دوسروں کو راحت پہنچانے کا شوق جیسی جستجو اور تگ و دو ہے۔ ذاکر صاحب کے نزدیک اعلیٰ تعلیم کا مقصد بھی حسن پاکی صداقت اور تعاون کے اوصاف کا حامل بنانا ہے۔ عبد اللہ ولی بخش قادری لکھتے ہیں:

"ذاکر صاحب کی نظر میں اعلیٰ تعلیم کا سب سے اہم اور افضل مقصد یہی ہے کہ وہ نوجوانوں میں خدمت کا جذبہ بیدار کرے۔'' (۱۰)

ذاکر حسین کی تعلیمی خدمات

تعلیمی میدان میں ذاکر حسین نے کئی اہم کارنامے انجام دیئے۔ انہوں نے معلّمی کا فریضہ انجام دیتے ہوئے اور ساتھ ہی گورنری اور صدر جمہوریہ کے عہدہ پر فائز ہوتے ہوئے بھی تصنیف و تالیف اور تحریر و تقریر کو جاری رکھا۔ وہ زمانہ طالب علمی ہی سے ایک نہایت ذہین ہوشمند اور سمجھدار طالب علم تھے۔ گو کہ وہ کلاس روم سے اس زمانہ میں زیادہ دلچسپی نہیں رکھتے تھے لیکن لائبریری، ریڈنگ روم اور خاص کتابوں کے علاوہ معلومات عامہ سے انہیں گہری دلچسپی تھی اور ان کی یادداشت اس قدر بلا کی تھی کہ جو ایک بار پڑھ لیا ذہن نشیں ہو جاتا تھا۔

ڈاکٹر ذاکرحسین کوقدرت نے تصنیف وتالیف کی بہترین صلاحتیں عطا کی تھیں۔انتہائی مصروفیت کے باوجود انہوں نے کئی کتابیں لکھیں اورتراجم بھی کیئے۔ان کی پہلی کتاب ''مبادی معاشیات'' ہے- یہ ایک ترجمہ شدہ کتاب ہے۔ذاکرحسین نے اس کا ترجمہ اس وقت کیا تھا جب وہ بی اے میں تھے۔''ریاست'' یہ ان کی دوسری کتاب ہے۔ دراصل یہ افلاطون کی ریاست کا اردو ترجمہ ہے۔اس کے متعلق مولانا اقبال احمد سہیل جیسے صاحب نظر کی رائے قابل غور ہے کہ'' افلاطون کو اردو آتی ہوتی تو یہی زبان اختیار کرتا (۱۱) معاشیات سے متعلق ان کی دوسری کتاب ''معاشیات: مقصداورمنہاج'' ہے۔اس کتاب کے حوالے سے پروفیسر آل احمد سرور لکھے ہیں:

> ''معاشیات: مقصد اور منہاج'' کہنے کو ایک چھوٹی سی کتاب ہے مگر اس میں معیاری تربیتی اور افہامی معاشیات کے تمام اصول نہایت دلنشیں اسلوب میں بیان کردیئے گئے ہیں۔'' (۱۲)

معاشیات سے ہی متعلق ایک اور کتاب ''معاشیات قومی" ہے۔ یہ ایک ترجمہ شدہ کتاب ہے۔ان کی ایک اورتصنیف ''تعلیمی خطبات'' ہے۔ یہ کئی یونیورسٹیوں میں دیئے گئے خطبات کا مجموعہ ہے۔اس کتاب سے ذاکرحسین کے علمی اور تعلیمی نظریات کا اندازہ ہوتا ہے۔ ہندوستان میں تعلیم کی ازسرنوتنظیم،ابوجان کی بکری اور دوسری کہانیاں ان کی دیگر کتابیں ہیں۔

ذاکرحسین کو بچوں کی تربیت اوران کی کردارسازی سے کافی دلچسپی تھی۔اسی لئے انہوں بچوں کے لئے کئی کہانیاں اورڈرامے بھی لکھے۔ چھدو، پوری جوکڑھائی سے نکل بھاگی،آدمی کی کہانی ستارے کی زبانی،عقاب،الوخان کی بکری،مرغی جواجمیر چلی ان کی مشہور کہانیاں ہیں۔ذاکرصاحب صرف کہانیاں نہیں لکھتے تھے بلکہ ان کہانیوں میں بچوں کے لئے کوئی سبق اور پیغام چھوڑ جاتے تھے۔جیسے ان کی کہانی ابوخان کی بکری آزادی کی سچی لگن پیدا کرتی ہے۔ "عقاب بھی جذبہ آزادی کوابھارتی ہے اورغلامی کی زنجیریں توڑنے پرآمادہ کرتی ہے۔آؤ گھر گھر کھیلیں،اس کھیل میں ہردھرم اور ہرقوم کے بچے شامل ہیں۔اس کہانی میں قومی یکجہتی کا پیغام دینے کی کوشش کی گئی ہے۔اسی طرح ''اسی سے ٹھنڈااوراسی سے گرم'' کہانی میں سائنس کی معلومات پیش کی گئی ہیں۔انہوں نے کہانیوں میں آسان،سہل اوردلچسپ زبان اوراسلوب کواختیارکیاہے۔ پروفیسر آل احمد سرور لکھتے ہیں:

"بچوں کے لئے آپ نے چھوٹی چھوٹی کہانیاں بھی لکھی ہیں۔زبان بالکل بچوں کی ہے۔اورموضوع بھی بچوں کی پسند کا۔لیکن بات اتنی گہری کہہ جاتے ہیں کہ بڑے بھی ان کو پڑھ کر سوچنے لگتے ہیں۔''(۱۳)

ذاکرحسین کی مزید تصانیف میں اعلیٰ تعلیم،حالی محبّ وطن،دوسری بنیادی تعلیمی کانفرنس،ذاکرصاحب کے خط، قومی تعلیم اور ہندوستان وممالک غیر شامل ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کو دیگر مصروفیات کی وجہ سے بہت کم پڑھنے لکھنے کا موقع ملا تھا۔اس کے باوجود انہوں نے بہت کچھ لکھا انہوں نے تعلیم کا کوئی ایسا شعبہ تشنہ نہیں چھوڑا جس پر اظہار خیال نہ کیا ہو اور اچھی راہ نہ بتائی ہو۔ذاکرصاحب ہمیشہ زندگیوں کو سنوارنے اور معاشرے کو سدھارنے میں لگے رہے۔

حوالہ جات

۱۔ڈاکٹرفہمیدہ بیگم(مرتبہ)،ڈاکٹر ذاکرحسین شخصیت ومعمار،ترقی اردو بیورو،نئی دہلی،1917،ص43

۲۔ڈاکٹر ذاکرحسین،تعلیمی خطبات،مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ،2012،ص16

۳۔الضاص:16

۴۔ایضاًص:16

۵۔عبداللہ ولی بخش قادری،تعلیمی افکارومسائل،مکتبہ جامعہ،دہلی2002،ص:76

۶۔ عبداللطیف اعظمی(مرتب)،ڈاکٹر ذاکرحسین سیرت وشخصیت،مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ دہلی،2011ص:99

۷۔ایضاًص:109

۸۔ڈاکٹر ذاکرحسین،تعلیمی خطبات،ص107

۹۔ایضاًص:108-107

۱۰۔عبداللہ ولی بخش قادری،تعلیمی افکارومسائل،مکتبہ جامعہ،دہلی،ص:77

۱۱۔عبداللطیف اعظمی،ڈاکٹر ذاکرحسین سیرت وشخصیت،ص:118

۱۲–الضاًص:119

۱۳۔ایضاً،ص:137

خواجہ غلام السیدین

حالات زندگی۔

خواجہ غلام السیدین 16 اکتوبر 1904 پیر کی صبح سے قبل تقریباً چار بجے پانی پت کے ایک علمی گھرانہ میں پیدا ہوئے۔ باپ اور چچا کی اولاد میں سیدین سب سے پہلے لڑکے تھے اس لئے ان کی ولادت سے سارا خاندان خوش تھا۔ صالحہ عابد حسین نے سیدین کی پیدائش کے سلسلے میں لکھا ہے کہ:

> ''تہجد کے وقت دادا نے یہ خوشخبری سنی تو جسم کے سارے کپڑے ایک فقیر کو بخش دیے اور کمبل لپیٹ کر گھر آئے''(۱)

خواجہ غلام السیدین الطاف حسین کے گھرانے سے تھے۔ خانوادہ حالی کا یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس گھرانے سے بڑے بڑے ادیب، قلم کار، فنکار، ماہر تعلیم، معلم، مصنف اور شاعر پیدا ہوئے۔ خواجہ احمد عباس جیسے افسانہ نگار، فلم نویس، صحافی۔ صالحہ عابد حسین، ساجدہ زیدی، زاہدہ زیدی جیسی ادیبہ، خواجہ غلام الثقلین اور خواجہ السیدین جیسے ماہر تعلیم، مصنف، معلم اسی گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ گویا حالی نے جس طرح علوم وفنون اور ادب کا بیج بویا تھا وہ کئی سالوں تک مختلف شخصیات کی شکل میں پھلتا پھولتا رہا۔

خواجہ غلام السیدین کی ابتدائی تعلیم کی شروعات میرٹھ سے ہوئی اس وقت ان کے والد خواجہ غلام الثقلین میرٹھ میں وکالت کرتے تھے۔ یہاں سیدین نے قرآن، علم قرآت وتجوید اور کچھ ابتدائی عربی و فارسی کتابیں پڑھیں۔ پھر انہیں پانی پت کے اسکول میں داخل کرا دیا گیا۔ جہاں ان کے چچا غلام الحسنین پڑھاتے تھے۔ انہوں نے یہاں چھٹی جماعت تک تعلیم حاصل کی۔ 1915 میں ایم بی اسکول پانی پت سے ساتویں جماعت پاس کیا۔ 1916 میں حالی مسلم ہائی اسکول پانی پت میں داخل ہوئے اور یہاں سے آٹھویں، نویں، دسویں اور گیارہویں جماعت کو مکمل کیا، پھر علی گڑھ

چلے آے یہاں سے 1921 میں ایف اے کا امتحان پاس کیا اور 1922 میں بی، اے مکمل کیا۔

بی۔اے پاس ہی کیا تھا کہ انہیں 1922 میں حکومت اتر پردیش کی طرف سے اعلی تعلیم کے لئے لندن جانے کا موقع مل گیا۔ جہاں انہوں نے لیڈز یونیورسٹی میں ڈپلومہ ان ایجوکیشن کورس میں داخلہ لیا۔ 1924 میں جب ان کا یہ کورس مکمل ہوا تو انہوں نے ایم ایڈ کورس میں داخلہ لیا۔ پہلے سال طلبہ کو ایک تحقیقی مقالہ لکھنا ہوتا تھا۔ سیدین صاحب نے اپنے لئے Modern Education of Europe and America کا موضوع منتخب کیا اور ایک سال میں مقالہ لکھ کر یونیورسٹی میں پیش کر دیا۔ 1924 میں تعلیم مکمل ہوئی تو وہ ہندوستان واپس آ گئے ۔ یہاں پہنچنے کے کچھ ہی دن بعد انہیں علی گڑھ کے ٹریننگ کالج کے پرنسپل کی حیثیت سے ملازمت مل گئی۔ انہیں ریڈر کا عہدہ دیا گیا۔ 1931 میں وہ پروفیسر ہو گئے ۔1937 میں جب گاندھی جی نے قومی تعلیم مہم کا آغاز کیا تو ایک قومی تعلیمی کانفرنس منعقد کی گئی۔ کانفرنس کے بعد ''بنیادی تعلیمی کمیٹی'' تشکیل دی گئی۔ ڈاکٹر ذاکر حسین اس کے صدر منتخب ہوئے۔ کمیٹی کے اراکین میں خواجہ کو بھی شامل کیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ السیدین صاحب کی کوششوں سے دو مہینوں میں ہی کمیٹی کی رپورٹ تیار ہو گئی -السیدین صاحب کی کارکردگی سے گاندھی جی اور ذاکر صاحب بہت متاثر ہوئے۔

1938 میں ریاست جموں و کشمیر میں ڈائرکٹر تعلیمات کی حیثیت سے ان کا تقرر ہو گیا۔ تعلیمی حیثیت سے یہ ریاست بہت پس ماندہ تھی۔ سیدین صاحب نے تعلیمی حالات کو بہتر بنانے کے لئے زبردست جدوجہد کی۔ جس میں وہ کافی حد تک کامیاب ہوئے۔ 1945 میں انہوں نے ڈائرکٹر تعلیمات کے عہدے سے استعفی دے دیا۔ اس کے بعد ریاست رام پور کے مشیر تعلیم مقرر ہوئے۔ دو سال اس عہدے پر کام کر کے بمبئ چلے گئے. جہاں مشیر تعلیم کی حیثیت سے ان کا تقرر ہو گیا تھا۔1950 تک وہ اسی عہدے پر فائز رہے۔ اسی سال مولانا ابوالکلام آزاد نے انہیں مرکزی وزارت تعلیم میں جوائنٹ سکریٹری کے عہدے پر مقرر کر دیا۔ کچھ دن کے لئے السیدین صاحب یونیسکو کے تعلیمی مشن پر عراق رہ کر اپنے عہدے پر واپس آ گئے ۔1954 میں مرکزی وزارت تعلیم کے اڈیشنل سیکریٹری ہو گئے۔ 1957 میں ترقی پا کر سکریٹری ہو گئے۔(۲)

السیدین صاحب کو شروع ہی سے تعلیم کا صحیح اور سازگار ماحول ملا تھا۔ وہ بچپن میں بھی عام بچوں سے الگ تھے۔ انہوں نے دیگر بچوں کی طرح، شرارت، ہنگامے،، ضدی پن اور ہٹ دھرمی کی شکایت کا موقع نہیں دیا۔ بزرگوں

کی باتیں ماننا، ڈسپلن کا خیال رکھنا اور لوگوں سے خلوص ومحبت کے ساتھ پیش آنا وہ بچپن میں ہی سیکھ چکے تھے۔ ایسی تربیت کی وجہ سید ین کی والدہ یعنی حالی کی پوتی تھیں۔ لہذا مولانا حالی کی سیرت کے تمام جوہر دردمندی، دلنوازی، دلداری، معاملہ فہمی، ذہانت، دوراندیشی انسان دوستی، اور انسانیت سے محبت پوتی ہونے کی حیثیت سے انہیں وراثت میں ملے تھے۔ السید ین کی شخصیت کو سنوارنے اور مکمل کرنے میں سب کا بڑا ہاتھ ان کی والدہ کا تھا اور ان کی سب سے پہلی معلم وہی تھی (۳)

السید ین صاحب نے اپنی تعلیمی زندگی میں کئی مما لک کا سفر اور کئی صوبے کا دورہ کیا لیکن ان کے تین سفر بہت اہم تھے۔ پہلا سفر حکومت عراق اور دوسرا حکومت سوڈان کی دعوت پر ان ملکوں کی تعلیمی تنظیم لئے اختیار کیا گیا۔ تیسرا سفر جس میں نیویارک کی کولمبا یونیورسٹی نے ان کو اور دنیا کے سات نامور ماہرین تعلیم کو بلا کر نشان خدمت سے سرفراز کیا۔ بھارت سے دو اعزاز پہلے ہی مل چکے تھے۔ ساہتیہ اکادمی " آندھی میں چراغ'' پر اور دوسرا اعزاز پدم بھوشن۔

19 دسمبر 1971 کو تین بجے دن 62 سال کی عمر میں خواجہ غلام السید ین اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ 20 دسمبر 1971 کی صبح نماز جنازہ ہوئی اور بارہ بجے دن جامعہ نگر اوکھلا کے قبرستان میں سوگواروں، پرستاروں اور عقیدت مندوں کے جم غفیر کی موجودگی میں دفن کئے گئے۔ (۴)

السید ین کا تصور تعلیم

خواجہ غلام السید ین کا شمار ہندوستان کے ان ماہرین تعلیم میں ہوتا ہے جن کو بین الاقوامی شہرت حاصل ہوئی۔ دنیا ان کو ماہر تعلیم کی حیثیت سے جانتی ہے۔ تعلیم ان کی زندگی کا شغل ہی نہیں تھا بلکہ مقصد حیات بھی تھا۔ انسانی زندگی کی جن اعلیٰ اور ابدی قدروں پر ان کا ایمان تھا ان کی حفاظت اور تبلیغ و ترسیل کے لئے تعلیم سے بہتر کوئی میدان نہیں تھا (5)

السید ین کے نظریہ تعلیم کا گہرائی سے مطالعہ کریں تو اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے یہاں فرد اور معاشرے کی بڑی اہمیت ہے۔ انہوں نے فرد کی ذات اور اس کی نفسی زندگی کو اولیت دی ہے لیکن معاشرتی زندگی کو بھی ان کے افکار میں اہم جگہ حاصل رہی ہے۔ چونکہ تعلیم کی اہم ذمہ داری فرد کو معاشرتی اقدار کی تفہیم دے کر اسے معاشرتی تقاضوں کی تکمیل کے قابل بنانا ہے اس لئے کہ تعلیم اور معاشرہ ایک دوسرے سے جدا رہ کر اپنا وجود برقرار نہیں رکھ

سکتے ،لہذا دونوں ہی ایک دوسرے پر انحصار کرتے ہیں۔ال سیدین فرد اور معاشرے کے تعلق کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''انسان تنہا بطور ایک فرد واحد زندگی بسر نہیں کرسکتا بلکہ اور افراد کے ساتھ مل جل کر رہتا ہے اور معاشرتی کاروبار اور مشاغل میں حصہ لیتا ہے۔معاشرت کا تعلق ہماری زندگی سے اس قدر گہرا اور لازمی ہے کہ انسانوں کی وہ حالت ایک دوسرے کے ساتھ معاشرے کی شکل میں وابستہ نہ ہوں ہمارے تصور سے باہر ہے۔سچ پوچھئے تو معاشرے کا رکن ہونا ہی انسان کو انسان بناتا ہے۔اس کے بغیر اس کی ذہنی اور روحانی قوتوں کی پوری نشوونما ہو ہی نہیں سکتی۔''(6)

فرد اور جماعت کے ربط پر زور دیتے ہوئے کہتے ہیں:

''تعلیم کا عمل افراد اور جماعت کے باہمی ربط اور تعلق پر منحصر ہے اور اس کا کوئی نظریہ اس وقت تک صحیح نہیں ہوسکتا جب تک کہ وہ اس ترازو کے دونوں پلڑوں پر برابر نہ اترے۔''(7)

ان کے تعلیمی افکار میں انسانی اقدار کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔یہ ان اثرات کا نتیجہ ہے جو اسلامی تہذیب اور ہندوستان کی قدیم تہذیبی روایات کے طور پر انہیں ورثے میں ملے۔ان کا خیال تھا کہ تمام دنیا کے انسانی اقدار ایک ہی جیسے ہیں لیکن صنعتی نظام نے ذہنی،تہذیبی اور نسلی اعتبار سے انسانی اقدار کو مختلف جغرافیائی اور نسلی گروہوں میں تقسیم کردیا ہے۔وہ ایک ایسے سماج کا وجود چاہتے تھے جس میں کسی بھی ملک کے باشندے چھوٹے بڑے نہ ہوں۔اس انسانی سماج میں دنیا کے تمام انسانی گروہ برابر کے شریک ہوں اور ہر گروہ کا برابر کا حق ہو۔تمام انسانی گروہ اپنے مذہب،تہذیب اور سماجی روایات کے اعتبار سے الگ تو ہوں لیکن ان کے اختلاف میں بھی وحدت ہو۔تمام انسانی سماج مختلف رنگوں کا ایک خوبصورت گلدستہ ہو۔

ال سیدین نے اپنی زندگی کا مقصد انسان کی فلاح و بہبود کو بنا لیا تھا۔ان کو مذہب سے گہرا تعلق تھا اور انہوں

نے مذہب کا بہت گہرائی سے مطالعہ کیا تھا۔ ان کی تصانیف میں جابجا قرآن شریف کے حوالے اور علامہ اقبال کے اشعار ملتے ہیں۔ کیونکہ وہ علامہ اقبال سے کافی متاثر تھے، جن سے پتا چلتا ہے کہ ان کے افکار کی تمام تر اساس اسلامی روایات اور ہندوستانی تہذیب کی بقائے باہمی کی اس فضا پر قائم ہے جس میں مختلف نظریات اعتقادات پہلو بہ پہلو نظر آتے ہیں۔ انہوں نے کلام پاک اور تفسیر پیغمبر اسلام اور ائمہ کی سیرتیں بہت تفصیل اور گہرائی سے پڑھی تھیں لیکن وہ ہر دھرم کی عزت کرتے تھے۔ ان کے اندر قوم اور مذہب کے تئیں تعصب پرستی نہیں تھی۔ ان کا ماننا تھا کہ "مسلمان کا یہ مسلک نہیں ہونا چاہئے کہ وہ دوسرے مذاہب کو برا کہے یا سمجھے بلکہ اسے ہر مذہب کا احترام کرنا چاہیے۔'' (8)

سیدین صاحب نے زبان کا بھی گہرائی سے مطالعہ کیا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ زبان صرف ایک دوسرے سے گفتگو کرنے کا ذریعہ ہی نہیں ہے بلکہ انسان کو کائنات کو سمجھنے اور پھر دوسروں کو سمجھانے کا ایک بہت بڑا ذریعہ بھی ہے۔ ہمیں زندگی کے ہر موڑ پر اور ہر قدم پر زبان کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ زبان محض ایک آلہ ہی نہیں ہے یہ شعور کا ایک لازمی اور ناگزیر حصہ بھی ہے۔ وہ کہتے ہیں:

> ''جب زبان مسخ ہو جاتی ہے تو اس کو ریا کاری، دھوکہ بازی ظلم اور تشدد کا آلہ بنالیا جاتا ہے۔ کروڑوں آدمی زبانوں کو اس طرح استعمال کرتے ہیں کہ ان میں خلوص، دیانت، اعلیٰ خیالات اور شریفانہ جذبات کا کوئی احترام نہیں پایا جاتا۔'' (9)

یہ ہر ذی شعور کو پتا ہے کہ زندگی میں تعلیم اور زبان کا کیا مقام ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ زبان کے معجزے اور لفظوں کے جادو نے انہیں ہمیشہ متاثر کیا ہے۔ یہ زبان ہی ہے جو انسان کو اشرف المخلوقات بناتی ہے اور جو انسان کو جانوروں سے ممتاز کرتی ہے۔ الفاظ کا استعمال احترام نفاست اور صداقت کے ساتھ ہو تو زبان کا مقام بلند ہو جاتا ہے۔ وہ ایک مقدس پیشہ یعنی معلم ہونے کی وجہ سے زبان کے صحیح استعمال کا خاص خیال رکھا کرتے تھے۔

سیدین صاحب قومی زندگی کو تعلیم کی اصل اساس سمجھتے تھے۔ تعلیم کو کامیاب بنانے کے لئے وہ اس بات کو ضروری سمجھتے تھے کہ اس کی جڑیں قومی زندگی میں گہری اور دور تک پھیلی ہوئی ہوں۔ اگر چہ انہوں نے انگریزی تعلیم کا

بطور خاص مطالعہ کیا تھا اور انگریزی دور حکومت میں پلے بڑھے تھے لیکن وہ اس بات کو شدت سے محسوس کرتے تھے کہ ملک کی تعلیمی نظام کے لئے یہ بے حد ضروری ہے کہ قومی زندگی کی روایات اور ملک کے مخصوص حالات کو پیش نظر رکھا جائے۔ اپنی کتاب "اصول تعلیم' کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

> میرا عقیدہ یہ ہے کہ اگر ہم اپنی مخصوص روایات، اپنی تہذیب وتمدن کے مطالبات، اپنی نفسی زندگی اور اپنے فلسفے کو پس پشت ڈال کر اندھا دھند کسی دوسرے ملک کی تقلید کریں گے تو ہرگز منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکتے۔ تعلیم کی جڑیں قومی زندگی کی گہرائی میں پنہاں ہیں۔(10)

تعلیم کے کئی مقاصد ہوتے ہیں جس میں سیرت کی تشکیل، کردار سازی، ذہنی، جسمانی اور روحانی تربیت وغیرہ شامل ہیں۔ تعلیم کا ایک خاص مقصد بچوں کو مستقبل کے لئے تیار کرنا بھی ہے تا کہ بچہ معاشرے کا خودمختار اور آزاد ممبر بن سکے اور اپنی روزی کے لیے کسی کا دست نگر نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ تقریباً ہر ماہر تعلیم نے تعلیم کا ایک مقصد ذریعہ معاش کا انتخاب بھی بتایا ہے۔ السیدین بھی اس کی پوری طرح حمایت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ وہ جگہ بہ جگہ تعلیم کو معاش اور دستکاری سے جوڑتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ''تعلیم کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ عام لوگوں کی کاروباری زندگی کے تنگ اور محدود کرنے والے اثرات کو دور کرنے کے لئے طلبہ کو مختلف قسم کے کاموں اور پیشوں کی وسیع تر اہمیت سے آگاہ کر کے انہیں ان کی نظر میں معنی خیز بنائے اور ان میں یہ بات پیدا کر دے کہ پیشے کی زندگی میں بھی اعلی مقاصد اور عین پسندی کو ہاتھ سے نہ جانے دیں۔ محض مشین بن کر نہ رہ جائیں بلکہ اپنی فطرت کی پوری بلندی اور وسعت کو حاصل کر سکیں اس لحاظ سے ہماری موجودہ تعلیم جو محض رسمی علوم وفنون تک محدود ہے اور تمدن کے زندہ مسائل سے ان کا ربط ظاہر نہیں کرتی بالکل نا قابل اطمینان ہے۔''(11)

اسی طرح وہ بچوں کی اخلاقی، جسمانی، روحانی، ذہنی، جذباتی اور دماغی تربیت کے فروغ کی بات کرتے ہیں۔ کیونکہ جن بچوں کے اندر یہ صفات نہ ہوں ان کا پڑھنا اور نہ پڑھنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ وہ تعلیم کو بڑے وسیع نظریے سے دیکھتے ہیں اور ساتھ ہی ایسے معلم اور استاد کی بات کرتے ہیں جو طلبا کی مکمل نشو ونما اور تربیت کا خیال رکھ سکے۔ وہ

لکھتے ہیں:

"ہم نے تعلیم کا جومفہوم اس کتاب میں پیش کیا ہے اس کی رو سے معلم کوصرف
بچوں کی دماغی نشو ونا ہی سے سروکار نہیں بلکہ اسے ان کی پوری شخصیت کی ترتیب
کرنی ہے جس میں جسم و دماغ اور روح سب شامل ہیں کیونکہ ان سب کا ایک
دوسرے سے نہایت قریبی تعلق ہے۔''(12)

سیدین صاحب نے تقریباً تعلیم کے ہر ہر پہلو پر روشنی ڈالی ہے۔انھوں نے بچوں کی جسمانی، ذہنی، اخلاقی، سماجی، تمدنی، معاشی اور روحانی تربیت سے لیکر تدوین نصاب، معلم کے اخلاق واوصاف، زبان وزندگی اور تعلیم وتعلم کے رشتے تک بات کی ہے۔انہوں نے تعلیم کے تمام پہلوؤں کا مطالعہ کیا تھا۔اسی مطالعے سے ان کے تعلیمی نظریات تشکیل پائے تھے۔یہ تعلیمی نظریات انہیں مغربی فکر اور مختلف زبانوں میں لکھی گئی کتابوں سے ہی نہیں ملے تھے بلکہ خود ان کے اپنے عمیق غور وفکر کا نتیجہ تھے۔

خواجہ غلام السیدین کی تصنیفی اور ادبی خدمات

السیدین کو تحریر وتصنیف کا ذوق وشعور ورثے میں ملا تھا۔انہیں اردو اور انگریزی دونوں زبانوں پر عبور حاصل تھا۔لیکن اردو سے مادری زبان ہونے کی وجہ سے قلبی لگاؤ تھا۔ان کی تصنیفات دونوں ہی زبانوں میں موجود ہیں۔ انگلش میں زیادہ تر کتابیں تعلیم سے متعلق ہیں جن کی فہرست کچھ یوں ہے:

1-School of future-1937

2-Iqbal educational philosophy-1938

3-Education for International understanding-1948

4-Problems of educational reconstruction-1950

5-Education,culture and social order-1952

6-Man in the new world-1964

7-Universities and the life of the mind-1965

8-The faith of an Educationist-1965

9-The humanist tradition in Indian educational thought-1966

10-Language,Life and Education-1971(14)

اردو میں بھی ان کی کئی کتابیں ہیں جن میں پہلی کتاب ''روح تہذب'' ہے۔اس کتاب میں کئی عنوانات پر گفتگو کی گئی ہے، کتاب کے پہلے حصے میں معاشرے کے خوشحال لوگوں، عالموں اور تعلیم یافتہ ومہذب کہلانے والے اشخاص کی بات کی گئی ہے۔روح تہذیب کے نصف آخر میں السیدین نے براہ راست تہذیب کے اصل اور حقیقی عناصر کی تعریف کی ہے۔اور مہذب انسان کی صفات بیان کی ہیں۔تہذیب کا تیسرا نظریہ سیدین نے ماہرین تعلیم کو بنایا ہے۔

ان کی دوسری کتاب "شہیدان وفا کا خوں بہا کیا'' ہے۔یہ ایک افسانوی مجموعہ ہے جس میں انہوں نے اپنے وطن پانی پت کی سماجی زندگی کے عدم توازن، قدامت پرستی اور روایت پرستی اور وہاں کے مضر صحت ماحول کو فرضی نام" کریم نگر کی بستی کے آئینے میں پیش کیا ہے۔''(15)

''قومی سیرت کی تشکیل" ان کی تیسری کتاب ہے۔اس کے بعد ان کی ایک اہم کتاب" آندھی میں چراغ منظر عام پر آتی ہے۔اس کتاب پر ان کو ساہتیہ اکادمی اوارڈ سے نوازا گیا تھا۔اس کتاب کے تین حصے ہیں۔پہلے حصے میں مذہبی شخصیات کے پیغام پر بات کی ہے۔دوسرے حصے میں سیاسی رہنماؤں، شاعروں، عزیزوں، بزرگوں اور دوستوں کا ذکر کیا ہے۔تیسرے حصے میں مستقبل کی تعمیر کے لئے انسانی اقدار کی اہمیت اور ضرورت پر بات کی ہے۔

ان کی دیگر تصانیف فکر انسانی کا سفر ارتقا، داستان اشک وخوں، مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زبان میں (خودنوشت) دنیا میرا گاؤں، زبان، زندگی اور تعلیم، ایک مرد درویش اور اصول تعلیم ہیں۔''اصول تعلیم''، تعلیم سے متعلق بہت اہم تصنیف ہے۔اس کتاب کے بارے میں سر راس مسعود نے اس کتاب کے مقدمے میں لکھا ہے:

> ''تعلیم اور اصول تعلیم خواجہ غلام السیدین صاحب کی اس کتاب سے بہتر آج تک کوئی کتاب نہیں لکھی گئی۔ یہ ایک ایسی کتاب ہے جس کو ہم فخریہ ان مستند کتابوں کے مقابلے میں پیش کر سکتے ہیں جو دوسرے ممالک میں اس مضمون پر لکھی گئی ہے۔.(16)

السیدین نے ان تصنیفات کے علاوہ مختلف رسالوں کے لئے مختلف مضامین لکھے جن میں دعوت عمل، فلسفۂ

انقلاب، شہید وفا، نہرو بحیثیت ایک معلم، اقبال ترقی پسند ادیب کی حیثیت سے وغیرہ شامل ہیں۔ السیدین صاحب کی جو خاص بات تھی وہ یہ تھی کہ انہوں نے اپنے موضوع کو محدود نہیں بنایا۔ وہ مختلف اور متنوع موضوعات پر بہت کچھ لکھتے رہے۔ انہوں نے سفر نامہ، خودنوشت، افسانے، خطوط لا اور انشائیہ کے علاوہ دیگر متعدد مضامین بھی لکھے۔ فن تعلیم پر بہت سی تحریریں ثبت کر کے داد وتحسین پائی اور اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔

حوالہ جات

۱۔ڈاکٹر سید فرحت حسین،خواجہ غلام السیدین: حیات اور کارنامے،محبوب پریس، دیو بند،1983،ص25

۲۔خلیق انجم (مرتبہ)،خواجہ غلام السیدین: مضامین اور تقریریں،انجمن ترقی اردو ہند دہلی،2004،ص8

۳۔ڈاکٹر سید فرحت حسین،خواجہ غلام السیدین: حیات اور کارنامے،ص86

۴۔ایضاً:ص:78

۵۔ایضاً ص 148

۶۔خواجہ غلام السیدین،اصول تعلیم،قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی 2006 (چوتھا اڈیشن) ص21

۷۔ڈاکٹر سید فرحت حسین،خواجہ غلام السیدین: حیات اور کارنامے،محبوب پریس، دیو بند،1983 ص166

۸۔آل احمد سرور (مرتبہ)،خواجہ غلام السیدین،انجمن ترقی اردو (ہند)،2004،ص36

۹۔خواجہ غلام السیدین،فکر انسانی کا سفر ارتقا،ص54

۱۰۔خواجہ غلام السیدین،اصول تعلیم،ص15

۱۱۔ایضاً ص87

۱۲۔ایضاً ص255

۱۳۔ڈاکٹر سید فرحت حسین،خواجہ غلام السیدین: حیات اور کارنامے،محبوب پریس، دیو بند،1983 ص267

۱۴۔آل احمد سرور (مرتبہ)،خواجہ غلام السیدین،انجمن ترقی اردو (ہند)،ص271۔270

۱۵۔ڈاکٹر سید فرحت حسین،خواجہ غلام السیدین: حیات اور کارنامے،محبوب پریس، دیو بند 1938 ص269

۱۶۔مقدمہ سر راس مسعود،خواجہ غلام السیدین،اصول تعلیم،ص9

حاصل مطالعہ

انیسویں صدی کے وسط سے بیسویں صدی کے نصف آخر تک پوری دنیا سیاسی اتھل پتھل کا شکار رہی۔ پہلی اور دوسری جنگ عظیم، استعماری طاقتوں کا عروج وانحطاط اور خلافت عثمانیہ کا زوال قابل ذکر واقعات ہیں جن سے ہندستان کے نہ صرف ارضی بلکہ سیاسی نقشہ میں بھی نمایاں تبدیلیاں واقع ہوئیں۔ 1857 کا غدر، ہندو مسلم مشترکہ روایت کو توڑنے والی انگریزی حکومت کی پالیسیاں، بھارت چھوڑ وتحریک میں عوا کا سرگرم کردار، انگریزوں کے کمزور ہو جانے پر دوقومی نظریے کے حامیوں کا ظہور، تقسیم ہند کے بعد ملک کی تشکیل نو کے لیے اٹھائے جانے والے اقدامات، آزادئی وطن کے بعد انگریزوں کے ذریعہ متعارف کرائے گئے جدید علوم کے نقوش واثرات اور ایجادات و اختراعات کو فروغ دینے والے ان کے محیر العقول کارنامے انیسویں اور بیسویں صدی کے تعلیمی نظریات پر اثر انداز ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

ہندوستان میں مغربی تہذیب اور طرز معاشرت کے ردوقبول کے ضمن میں چار طرح کے طبقات سامنے آئے۔ سب سے پہلے علما اور عام لوگوں کا وہ طبقہ جس نے نہ صرف فرنگی تہذیب سے سخت بیزاری کا اظہار کیا یہاں تک کہ انگریزی زبان بولنے، سیکھنے اور پڑھنے پر کفر کے فتوے صادر کیے۔ جب کہ دوسرے طبقہ نے اپنی کمزور روحانی وملی وابستگی، اثر پذیر طبعیت اور ابن الوقت فطرت کے باعث فرنگی تہذیب کی اندھی تقلید کی۔ تیسرا طبقہ اپنی روحانی اور ملی قدروں کو اساس بنا کر مغرب کی تعلیمی وعلمی قدروں اور تہذیبی خوبیوں سے استفادہ کرنے کا داعی بنا۔ ہندوستانی معاشرت کا چوتھا گروہ وہ تھا جو مغرب کی تعلیمی وعلمی قدروں کا مداح ضرور تھا تاہم اس لحاظ سے محتاط تھا کہ مغرب سے تعلیمی وعلمی استفادہ کہیں نوجوانوں کے ذہنوں کو مغرب زدہ نہ کرے۔ چنانچہ ان لوگوں نے مغربی علم وفن سے استفادہ کرنے کے ساتھ ساتھ دینی وروحانی قدروں کے فروغ پر زور دیا اور تہذیب کے مضر اثرات کی بھی نشاندہی کی اور ان سے بچنے پر زور قلم صرف کیا۔ اس دور کے موخر الذکر طبقہ کے نمائندہ اکبر الہ آبادی تھے۔ اکبر الہ آبادی نے تہذیب مغرب کی یلغار کا بڑی ہمت سے مقابلہ کیا اور اپنی تہذیبی قدروں کے دفاع میں کسی مصلحت کو سدراہ نہ بننے دیا۔ اکبر الہ آبادی کی فراہم کردہ تنقیدی بنیادوں پر بعد میں علامہ اقبال نے اپنے مخصوص علمی وفلسفیانہ افکار کی بنا رکھی اور قوم کو فرنگی تہذیب کی ظاہری چکا چوند کی حقیقت اور کھوکھلی بنیادوں سے آگاہ کیا۔

یہاں سرسید کا ذکر نہایت ضروری ہے۔ کیونکہ جب انیسویں صدی کے دوسرے نصف میں برطانوی سلطنت

کے ہند میں استحکام کے بعد مسلمانوں کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ اپنے مذہب کے تحفظ اور تہذیب کی بقا کا تھا، مغربی علوم کا سیل بیکراں اُمڈتا چلا آ رہا تھا اور سیاسی زوال کے ساتھ قدیم اسلامی علوم کے پاوں بھی اکھڑ رہے تھے تو اس صورت حال کا سامنا کرنے کی دو ہی صورتیں ممکن تھیں۔ایک تو یہ کہ مسلمان مغربی علوم سے قطع نظر کر کے اپنے حصار میں بند ہو جائیں۔یہ راستہ اکثر علما و محدثین نے اختیار کیا۔دوسری صورت یہ تھی کہ مغربی علوم سے فیض اٹھا کر اپنے اور اس سے متعلق علوم کے نئے تقاضوں سے ہم آہنگ کیا جاے۔سرسید نے دوسرا راستہ اختیار کیا۔اگر سرسید بر وقت مسلمانوں کی رہنماءنہیں کرتے تو مسلمان ہم وطنوں اور دیگر قوموں سے شاید ایک اور صدی پچھے رہ جاتے،اس لئے کہ جو لوگ وقت کا ساتھ دیتے ہیں وقت کے ساتھ چلتے ہیں اور زمانے کے نبض کو پہچانتے ہیں وہ ترقی کرتے ہیں اور جو لوگ ایسا نہیں کرتے پچھے رہ جاتے ہیں۔

اگر بات کی جاے تعلیم نسواں کی تو ہمارے مفکرین تعلیم نسواں کی پرزور حمایت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔مولانا آزاد تعلیم نسواں کی پرزور حمایت کرتے تھے۔ان کا عقیدہ تھا کہ عورتوں کی تعلیم سنہرے مستقبل کی ضمانت ہے اور اس کے بغیر مستقبل کا کوئی بھی منصوبہ بیکار جائے گا۔انہیں اس بات کی خوشی تھی کہ مسلم قوم کو اس بات کا اعتراف ہے کہ عورتوں کی تعلیم ہونی چاہیے مگر عملی سطح پر اس سلسلے میں جو کوتاہیاں برسوں سے برتی جارہی ہیں وہ ان سے سخت نالاں تھے۔عورتوں کی تعلیم سے ان کا مقصد صرف یہ نہیں تھا کہ انہیں اردو،عربی،فارسی کی چند کتابیں پڑھادی جائیں بلکہ وہ تعلیم نسواں کو وسیع معنی میں دیکھتے تھے۔وہ چاہتے تھے کہ عورتوں کے لیے تعلیم کا ایسا ہی بندوبست ہو جیسا مردوں کے لیے ہمارے سماج نے بنا رکھا ہے۔ان کی تعلیم و تربیت کا ایسا مکمل نظام ہو جس سے انہیں اپنی شخصیت کے گوشوں کو ابھارنے کا موقع ملے جس سے انہیں فطری آزادی حاصل ہو اور وہ خود سے دین و دنیا کی اچھی و بری چیزوں میں تمیز کر سکیں۔

اقبال بھی مردوں کی طرح عورتوں کی تعلیم کے زبردست خواہاں تھے۔وہ کہتے ہیں:

''مرد کی تعلیم صرف فرد واحد کی تعلیم ہے مگر عورت کو تعلیم دینا حقیقت میں تمام خاندانوں کو تعلیم دینا ہے۔دنیا میں کوی قوم ترقی نہیں کر سکتی اگر اس قوم کا آدھا حصہ جاہل مطلق رہ جاے''

اقبال کہتے ہیں کہ عورت اگر علم و ہنر کے میدان میں کوئی بڑا کارنامہ انجام نہ دے سکے تو اس کا مرتبہ کم نہیں ہوتا۔اس کے لیے کیا یہ شرف کم ہے کہ زندگی کے ہر میدان میں کارہاے نمایاں انجام دینے والے مشاہیر اسی کی گود میں

پروان چڑھتے ہیں۔

اسی طرح اکبرالہ آبادی تعلیم نسواں کی وکالت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ چنانچہ جب ان سے بیگم خواجہ حسن نظامی نے تعلیم نسواں کے بارے میں ان کا خیال جاننا چاہی تو اکبر نے کہا:

''میں عورتوں کی تعلیم کا مخالف نہیں ہوں۔انہیں تعلیم ملنی چاہیے۔انہیں مذہب سے واقفیت بھی ضروری ہے۔حفظان صحت کے اصولوں سے بھی واقف ہونا چاہیے۔حساب کتاب بھی انا چاہیے اور اخلاقی اور سبق آموز کتابیں ان کے مطالعے میں رہنی چاہیے تا کہ وہ اپنے بچوں کی اچھی تربیت کر سکیں''

خواجہ غلام السیدین اپنے وقت کے ایک عظیم ماہر تعلیم اور کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ان کے تعلیمی افکار میں انسانی اقدار کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ یہ ان اثرات کا نتیجہ ہے جو اسلامی تہذیب اور ہندوستان کی قدیم تہذیبی روایت کے طور پر سیدین کو ورثے میں ملے تھے۔ان کا خیال تھا کہ تمام دنیا کے انسانی اقدار ایک ہی جیسے ہیں لیکن صنعتی نظام نے ذہنی، تہذیبی اور نسلی اعتبار سے انسانی اقدار کو مختلف جغرافیائی و نسلی گروہوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ وہ ایک ایسے سماج کا وجود چاہتے تھے جس میں کسی بھی ملک کے باشندے چھوٹے بڑے نہ ہوں۔ سب برابر کے شریک ہوں اور ہر گروہ کا برابر کا حق ہو۔

کتابیات

۱-بختیار حسین صدیقی، اقبال بحیثیت مفکر تعلیم، حمایت اسلام پریس لاہور،۱۹۸۳ء

۲-جے کرشن مورتی، تعلیم اور زندگی کی اہمیت، مفتی پرنٹنگ اینڈ پبلی کیشنز وارانسی،۱۹۹۸ء

۳-ڈاکٹر ریاض احمد، تعلیم وتدریس کے روشن پہلو، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی،۲۰۱۱ء

۴-ڈاکٹر بشری رحمٰن، مولانا ابوالکلام آزاد ایک مطالعہ، کاکوری آفسٹ پریس لکھنو،۲۰۰۵ء

۵-ڈاکٹر سلامت اللہ، ہندوستان میں مسلمانوں کی تعلیم، مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ دہلی،۱۹۹۰ء

۶-ڈاکٹر وحید قریشی، تعلیم کے بنیادی مباحث، شرکت پرنٹنگ پریس لاہور،۱۹۹۸ء

۷-ڈاکٹر سید عابد حسین، قومی تہذیب کا مسئلہ، انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ،۱۹۵۵ء

۸-ڈاکٹر سلامت اللہ، تعلیم، فلسفہ اور سماج، مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ نئی دہلی،۱۹۸۰ء

۹-ڈاکٹر ذاکر حسین، اعلی تعلیم، مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، دہلی،۲۰۱۲ء

۱۰-ڈی ایس گورڈن، اصول تعلیم اور عمل تعلیم، ترقی اردو بیورو نئی دہلی،۱۹۸۱ء

۱۱-سید نوراللہ، تاریخ تعلیم ہند، نیشنل بک ٹرسٹ نئی دہلی،۱۹۶۵ء

۱۲-شیخ محمد اکرام، موج کوثر، مکتبہ جدید پریس لاہور،۲۰۰۳ء

۱۳-ضیاءالحسن فاروقی، شہید جستجو، مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ نئی دہلی،۲۰۱۱ء

۱۴-ضیاء الحسن فاروقی، مسلمانوں کا تعلیمی نظام، مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ نئی دہلی،۲۰۱۱ء

۱۵-ضیاءالحسن فاروقی، مولانا ابوالکلام آزاد فکر ونظر کی چند جہتیں، مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ،۲۰۱۱ء

۱۶-طفیل احمد منگلوری، مسلمانوں کا روشن مستقبل، نظامی پریس بدایوں،۱۹۳۸ء

۱۷-عبداللہ بٹ، ابوالکلام آزاد، قومی کتب خانہ لاہور،۱۹۴۳ء

۱۸-عبدالحق، مطالعہ سرسید احمد خان، ایجوکیشنل بک ہاوس علی گڑھ،۱۹۸۹ء

۱۹-محمد احمد صدیقی، اقبال کے تعلیمی نظریات، اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ پاکستان،۱۹۶۵ء
۲۰-محمد اکرام خان، مفکرین تعلیم، مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ ن ء دہلی،۲۰۱۱ء
۲۱-مرتبہ: شان محمد، سرسید کے مذہبی، تعلیمی اور سیاسی افکار ایک تنقیدی جائزہ، سرسید اکاڈمی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی،۱۹۶۵ء
۲۲-مرتبہ: ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہانپوری، مولانا ابوالکلام آزاد ایک سیاسی مطالعہ، اشتیاق، اے مشتاق پریس لاہور،۲۰۱۲ء
۲۳-مولانا ابوعلی اثری، امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد، زاہد بشیر پرنٹرز لاہور،۲۰۰۵ء

AS PER THE UNIVERSITY POLICY, ANTI-PLAGIARISM SCREENING IS NOT REQUIRED FOR THE REGIONAL LANGUAGES

Librarian
Indira Gandhi Memorial Library
UNIVERSITY OF HYDERABAD
Central University P.O.
HYDERABAD-500 046.